اِسلامیات
(لازمی)
برائے
اِنٹرمیڈیٹ
بلوچستان ٹیکسٹ بُک بورڈ، کوئٹہ

اِسلامیات

لازمی

انٹرمیڈیٹ کلاسوں کے لیے

برائے

بلوچستان ٹیکسٹ بک بورڈ، کوئٹہ

بمطابق نوٹیفیکیشن نمبر 719-89/Res/1993 مورخہ 93-6-12
قومی کمیٹی برائے جائزہ کتب وفاقی وزارت تعلیم حکومت پاکستان کی منظور کردہ۔

مصنّفین:-

پروفیسر حسن الدین ہاشمی
پروفیسر محبوب الرحمٰن
شیخ سعید اختر
مولانا تلمیذ الحسن رضوی
مسٹر عنایت علی خان
مولانا عبد الرشید نعمانی

نگران طباعت: حبیب اللہ سعیدی

خطّاط:
اصغر خورشید عالم

پرنٹرز: قلات پریس جناح روڈ کوئٹہ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پیش لفظ

پاکستان کا اساسی نظریۂ حیات اسلام ہے اور حکومتِ پاکستان کی کوشش ہے کہ تمام درجوں کے طالب علموں میں اِسلامی تشخص کو اُبھارا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے پورے نظامِ تعلیم میں اسلامیات کی تعلیم و تدریس کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ انٹرمیڈیٹ کے طلبہ کی ضروریات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے، یہ کتاب "اسلامیات لازمی" تیار کی گئی ہے۔ اس کتاب میں مجموعی طور پر نصاب کو متوازن رکھنے اور طلبہ کو درسی کتب کے بارے میں غیر معمولی اضافے سے بچانے کے لیے، صِرف اِسلام کے بُنیادی مُسلّمات کے بارے میں جامعیّت کے ساتھ ضروری معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ اس سے وہ اس قابل ہوجائیں گے کہ بعد میں اپنے طور پر آئندہ اِن موضوعات کا خود مُطالعہ کر سکیں۔

یہ کتاب پہلے وفاقی حکومت کی جانب سے شائع کی جاتی تھی۔ اور اب اسے ضروری ترمیمات کر کے نئی ترتیب کے ساتھ بلوچستان ٹیکسٹ بک بورڈ کی جانب سے شائع کیا جا رہا ہے۔

بلوچستان ٹیکسٹ بک بورڈ۔ کوئٹہ

فہرست

باب اوّل

بُنیادی عقائد

لفظ عقیدہ ۔ عقد سے بنا ہے ۔جس کے معنی ہیں باندھنا اور گرہ لگانا۔ تو عقیدہ کے معنی ہُوئے باندھی ہُوئی چیز ۔ گرہ لگائی ہُوئی چیز۔ انسان کے پختہ اور اٹل نظریات کو عقائد کہا جاتا ہے۔ اس کا ہر کام انہی نظریات کا عکس ہوتا ہے ۔ یہ عقائد اس کے دل و دماغ پر حکمرانی کرتے ہیں۔ یہی اس کے اعمال کے مُحرّک ہوتے ہیں ۔

عقیدے کی مثال ایک بیج جیسی ہے اور عمل اس بیج سے اُگنے والا پودا۔ یہ ظاہر ہے کہ پودے میں وہی خصوصیات ہوں گی جو بیج میں پوشیدہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام پیغمبروںؑ نے اپنی تبلیغ کا آغاز عقائد کی اصلاح سے کیا۔ سیّدِ دوعالم حضرت محمّد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے بھی جب مکہ مُکرّمہ میں پیغامِ رسالت پہنچانا شروع کیا تو سب سے پہلے عقائد کی اِصلاح پر زور دیا۔ اسلام کے بنیادی عقائد یہ ہیں۔ توحید، رسالت، ملائکہ، آسمانی کتابوں اور آخرت پر ایمان لانا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

وَلٰـكِنَّ الْـبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّـبِيّٖنَ ج (سورۃ البقرۃ : ۱۷۷)

ترجمہ : لیکن بڑی نیکی تو یہ ہے جو کوئی ایمان لائے اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور سب کتابوں اور پیغمبروں پر ۔

توحید

توحید کا مفہوم

اسلامی عقائد میں سب سے پہلا عقیدہ توحید کا ہے۔ توحید کے لُغوی معنی ہیں ایک ماننا۔ یکتا جاننا۔ دین کی اصطلاح میں اس سے مراد یہ ہے کہ سب سے برتر و اعلیٰ اور ساری کائنات کی خالق و مالک ہستی کے واحد و یکتا ہونے پر ایمان لانا اور صرف اسی کو عبادت کے لائق سمجھنا۔ حضرت آدم علیہ السّلام سے لے کر ختم المرسلین حضرت محمد رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم تک جتنے بھی پیغمبر تشریف لائے سب نے لوگوں کو توحید کی تبلیغ کی اور انھیں بتایا کہ کائنات کی تمام اشیاء اللہ ہی کی مخلوق اور سبھی اس کے عاجز بندے ہیں۔ اس لیے صرف اللہ ہی کی عبادت کرنی چاہیے۔ اور اسی کے احکام کو ماننا چاہیے۔

وُجُودِ باری تعالیٰ

جب بھی ہم کِسی بنی ہُوئی چیز کو دیکھتے ہیں تو ہمارا ذہن اس کو بنانے والے کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ مکان کو دیکھیں تو معمار کا تصوُّر آجاتا ہے۔ گھڑی دیکھیں تو گھڑی ساز کا تصوّر آجاتا ہے۔ کیونکہ ہم یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ کوئی مکان معمار کے بغیر یا کوئی گھڑی، گھڑی ساز کے بغیر بن سکتی ہے۔ اسی طرح جب کائنات پر غور کیا جائے تو ضرُور اس کے بنانے والے کا خیال آئے گا۔ کیونکہ کوئی صحیح ذہن اِس بات کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا کہ اتنا بڑا منظّم و مربوط جہان کِسی بنانے والے کے بغیر خود بخود بن گیا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا

ہے :-

اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط (سورۃ ابراہیم : ۱۰)

ترجمہ : کیا اللہ میں شبہ ہے جس نے بنائے آسمان اور زمین۔

کائنات پر جب گہری نظر ڈالی جائے تو اِس میں ایک نظم وضبط نظر آئے گا۔ کہیں بھی بے ترتیبی نہیں ملے گی۔

اَلَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ط مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ط فَارْجِعِ الْبَصَرَ لا هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ○ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِیْرٌ ○ سورۃ الملك : (۳:۴)

ترجمہ : (وہی اللہ ہے) جس نے سات آسمان تہ بہ تہ پیدا کر دیئے تو (خدائے) رحمٰن کی صنعت میں کوئی فتور نہ دیکھے گا سو تو پھر نگاہ ڈال کر دیکھ لے۔ کہیں تجھ کو کوئی خلل نظر آتا ہے؟ پھر بار بار نگاہ ڈال کر دیکھ۔ لوٹ آئے گی تیرے پاس تیری نگاہ ردّ ہوکر، تھک کر۔

سورج اپنے مدار میں گردش کر رہا ہے اور چاند اپنے مدار میں۔ سورج چاند کے مدار میں نہیں جاتا اور چاند سُورج کی طرف نہیں بڑھتا۔ اِسی طرح ایک خاص وقت تک رات رہتی ہے اور ایک خاص وقت تک دن۔

لَا الشَّمْسُ یَنْۢبَغِیْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّیْلُ سَابِقُ

النَّهَارِ ط وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝ (سورۃ یٰسٓ : ۴۰)

ترجمہ: نہ آفتاب کی مجال ہے کہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن سے پہلے آسکتی ہے اور سب ایک ایک دائرے میں تیر رہے ہیں۔

کائنات کی ہر چیز میں ایک مقرر اندازہ اور خاص نظم وضبط پایا جاتا ہے :۔

اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ (سورۃ القمر: ۴۹)

ترجمہ: ہم نے ہر چیز کو (ایک خاص) اندازے سے پیدا کیا ہے۔

کائنات کا یہ نظم وضبط اس بات کی روشن دلیل ہے کہ ایک ایسی اعلیٰ و برتر ذات موجود ہے جس نے کائنات میں یہ خوب صورت نظام پیدا فرمایا ہے۔

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۝ (سورۃ آل عمران: ۱۹۰)

ترجمہ: بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات دن کے ادل بدل میں اہلِ عقل کے لیے (بڑی) نشانیاں ہیں۔

دن، رات، چاند، سورج اور زمین و آسمان کا نظم وضبط سب اللہ تعالیٰ کی حکمت و کاریگری کی نشانی ہے۔

صُنْعَ اللّٰہِ الَّذِیْٓ اَتْقَنَ کُلَّ شَیْءٍ ؕ (سورۃ النمل: ۸۸)

ترجمہ: کاریگری اللہ ہی کی ہے جس نے ہر چیز کو مضبوط بنا رکھا ہے۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوا:۔

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَیْرِ شَیْءٍ اَمْ ھُمُ الْخٰلِقُوْنَ ؕ۝ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ بَلْ لَّا یُوْقِنُوْنَ ؕ۝ (سورۃ الطور ۳۵: ۳۶)

ترجمہ: کیا یہ لوگ بغیر کسی کے (پیدا کیے) پیدا ہو گئے ہیں۔ یا یہ کہ خود (اپنے) خالق ہیں۔ یا انھوں نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کر لیا ہے؟ اصل یہ ہے کہ ان میں یقین ہی نہیں۔

جس طرح زمین و آسمان اور ساری کائنات وجودِ باری تعالیٰ کی گواہی دیتی ہے، اسی طرح انسان کی فطرت کی آواز بھی یہی ہے۔ انسانی تاریخ کے مطالعہ سے مہذّب سے مہذب اور وحشی سے وحشی ہر طرح کی قوموں میں قادرِ مُطلق کی ذات کا اعتراف ملتا ہے۔ آثارِ قدیمہ کی تحقیقات سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ دُنیا کے مختلف گوشوں میں بسنے والی وحشی اقوام جن کی فکری و ذہنی سطح بہت پست تھی وہ بھی کسی نہ کسی شکل میں اللہ کے وجود کی قائل تھیں۔ اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وُجودِ باری تعالیٰ پر ایمان، انسان کی فطرت میں داخل ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوا:۔

فِطْرَتَ اللہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا ط (سورۃ الروم: ۳۰)

ترجمہ: اللہ کی اس فطرت (کا اتباع کرو) جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔
ایک اور مقام پر ارشاد ہوا:۔

وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ ○ وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ ط اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ○ (الذٰریٰت: ۲۰، ۲۱)

ترجمہ: اور زمین میں (بہت سی) نشانیاں ہیں یقین لانے والوں کے لیے اور خود تمہاری ذات میں بھی۔ تو کیا تمہیں دکھائی نہیں دیتا۔

کائنات کو بنانے والی یہ اعلیٰ و برتر ہستی صرف ایک ہی ہے۔ انسان کی صحیح سوچ اسے اسی نتیجہ پر پہنچاتی ہے۔ کیونکہ اگر ایک سے زیادہ خدا ہوتے تو ان کے باہمی تصادم کی وجہ سے کائنات کا یہ نظام ایک لمحہ کے لیے بھی قائم نہ رہ سکتا۔ لیکن کائنات تو اپنی مربُوط و منظّم شکل میں موجود ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ معبودِ برحق صِرف ایک ہی ہے۔ قرآنِ مجید میں ارشاد ہوا

لَوْ کَانَ فِیْھِمَآ اٰلِھَۃٌ اِلَّا اللہُ لَفَسَدَتَا ج (سورۃ الانبیاء: ۲۲)

ترجمہ: اگر ان دونوں (یعنی زمین و آسمان) میں علاوہ اللہ کے کوئی معبُود ہوتا تو ان دونوں میں فساد برپا ہو جاتا۔

ذات وصفاتِ باری تعالیٰ

عقیدۂ توحید کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کی ذات میں

بھی اور صفات میں بھی اور صفات کے تقاضوں میں بھی یکتا تسلیم کیا جائے۔ ذات کی یکتائی کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور حقیقت میں کوئی دُوسرا فرد حصہ دار نہیں۔ لہٰذا نہ اس کی کوئی برابری کر سکتا ہے، اور نہ اس کا کوئی باپ یا اولاد ہے کیونکہ باپ اور اولاد کی حقیقت ایک ہی ہوتی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کی حقیقت میں کوئی شریک نہیں تو نہ اللہ تعالیٰ کسی کا بیٹا، بیٹی ہے اور نہ اس کا کوئی بیٹا۔ بیٹی۔

قرآن مجید میں ارشادِ خداوندی ہے :-

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۙ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۚ (سورۃ الاخلاص: ۱-۴)

ترجمہ : آپؐ کہہ دیجیے کہ وہ اللہ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ نہ اس کے کوئی اولاد ہے نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور نہ کوئی اس کے برابر کا ہے۔

صفات باری تعالیٰ کی یکتائی کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسی صفات کاملہ کا مالک ہے جو کسی اور فرد میں موجود نہیں۔ وہ اپنے عِلم، قدرت، ارادہ، سمع، بصر، ہر صفت میں یکتا اور بے مثل ہے۔

صفات کے تقاضوں میں یکتائی کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ساری کائنات کو پیدا کیا، وہی سب کا مالک و رازق ہے۔ سب اسی کے محتاج ہیں۔ وہی سب کچھ دینے والا ہے۔ لہٰذا تمام مخلوق پر لازم ہے کہ وہ اپنے خالق و مالک اور قدیر و علیم پروردگار کی عبادت و بندگی بجا لائیں اور کِسی دوسرے کو اس میں اس کا شریک نہ بنائیں اور اس کے سوا کِسی

دوسرے کی عبادت نہ کریں۔

شرک عقیدہ توحید انسان کا سب سے پہلا عقیدہ ہے۔ شرک اور اس کی تمام اقسام بعد کی پیداوار ہیں۔ دنیا کا پہلا انسان عقیدۂ توحید ہی کا قائل تھا۔ پہلے انسان حضرت آدم علیہ السّلام تھے۔ جو اللہ تعالیٰ کے پہلے نبی تھے۔ آپ نے اپنی اولاد کو بھی اسی عقیدہ کی تعلیم دی مگر جیسے جیسے انسانی آبادی میں اضافہ ہوتا گیا اور لوگ اِدھر اُدھر بکھرنے لگے تو آہستہ آہستہ لوگوں نے سچّی تعلیمات کو بُھلا دیا اور گمراہی کا شکار ہوکر ایک خُدائے بزرگ و برتر کی بجائے کئی خدا ماننے لگے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ انہیں بھی معبود بنا لیا۔ ان لوگوں نے جِس چیز کو ہیبت ناک دیکھا اس سے ایسے خوفزدہ ہُوئے کہ اسے دیوتا سمجھ لیا اور اس کی پُوجا پاٹ شروع کردی، اس طرح انھوں نے آگ کا دیوتا، سمندر کا دیوتا اور آندھیوں وغیرہ کے دیوتا گھڑ لیے۔ دوسری طرف جِن چیزوں کو بہت نفع بخش پایا ان کی بھی پُوجا شروع کردی۔ گائے وغیرہ کی پُوجا اسی وجہ سے شروع ہُوئی۔ ان لوگوں کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ نے یکے بعد دیگرے کئی پیغمبر بھیجے، جنھوں نے ان کو توحید کا بُھولا ہُوا سبق یاد دلایا اور شرک کی مذمّت کی۔ قرآن مجید میں شرک کو بہت بڑا ظلم کہا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ ○ (سُورۃ لقمان: ۱۳)

ترجمہ: بے شک شرک بڑا بھاری ظلم ہے۔

ایک دُوسری جگہ ارشاد ہُوا :-

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ج (سورۃ النسآء : ۴۸)

ترجمہ : اللہ تعالیٰ (یہ بات) معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک بنایا جائے۔ لیکن اس کے علاوہ جس کسی کو بھی چاہے گا بخش دے گا۔

شرک کے لغوی معنی "حصّہ داری" اور "ساجھے پن" کے ہیں۔ دین کی اصطلاح میں شرک کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات، یا صفات، یا صفات کے تقاضوں میں کسی کو اس کا حصّہ دار اور ساجھی ٹھہرانا۔ اس طرح شرک کی تین اقسام ہیں۔

۱: ذات میں شِرک

اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حقیقت میں کسی دوسرے کو حصّہ دار سمجھنا۔

اس کی ایک صورت یہ ہے کہ کسی دوسرے میں یہی حقیقت مان کر اسے اللہ تعالیٰ کا ہمسر اور برابر سمجھنا۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کسی کی اولاد سمجھنا یا کسی کو اللہ تعالیٰ کی اولاد سمجھنا، کیونکہ والد اور اولاد کی حقیقت ایک ہی ہوتی ہے۔ لہٰذا جس طرح دو خداؤں یا تین خداؤں کو ماننا شرک ہے اسی طرح کسی کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا یا بیٹی سمجھنا بھی شرک ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ (سورۃ الاخلاص : ۳-۴)

ترجمہ: نہ اس سے کوئی اولاد ہے نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور نہ کوئی اس کے برابر کا ہے۔

۲: صفات میں شرک

اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا تعالیٰ جیسی صفات کسی دوسرے میں ماننا اور اُس جیسا علم، قدرت یا ارادہ کسی دوسرے کے لیے ثابت کرنا، کسی دُوسرے کو ازلی و ابدی سمجھنا یا کسی دوسرے کو قادرِ مُطلق تصوّر کرنا، یہ سب شرک ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ج (سورۃ الشوریٰ: ۱۱)

ترجمہ: کوئی چیز اس کے مثل نہیں۔

کیونکہ ہر مخلوق اللہ تعالیٰ کی مُحتاج ہے، جِس میں جو صفت بھی پائی جاتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات ذاتی ہیں کسی کی عطا کردہ نہیں۔

۳: صفات کے تقاضوں میں شرک

اللہ تعالیٰ عظیم صفات کا مالک ہے۔ ان صفات کی عظمت کا تقاضا یہ ہے کہ صرف اسی کی عبادت کی جائے، اور اُسی کے سامنے پیشانیاں جُھکائی جائیں۔ حقیقی اطاعت و مَحبّت کا صِرف اسی کو حق دار سمجھا جائے اور یہ ایمان رکھا جائے کہ وُہی کارساز ہے۔ اقتدارِ اعلیٰ صِرف اُسی کے ہاتھ میں ہے۔ اُسی کے قوانین پر عمل کرنا ضروری ہے اور اس کے قوانین کے مقابلے میں کسی کا قانون کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوا:-

أَلَّا تَعْبُدُوْٓا إِلَّآ إِيَّاهُ (سورۃ الاسراء:۲۳)

ترجمہ: تم صرف اسی کی عبادت کیا کرو۔

وَإِلٰهُكُمْ إِلٰهٌ وَّاحِدٌ ج لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ (سورۃ البقرۃ:۱۶۳)

ترجمہ: اور تمہارا معبود ایک خدا ہے۔ بجز اس کے کوئی معبود نہیں ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰٓئِكَ
هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ○ (سورۃ المائدۃ: ۴۴)

ترجمہ: اور جو کوئی اللہ کے نازل کیے ہوئے (احکام) کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو یہی لوگ تو کافر ہیں۔

إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ ط (سورۃ یوسف: ۴۰)

ترجمہ: حکم صرف اللہ کے لیے ہے۔

اللہ تعالیٰ ہی کو مُنعِمِ حقیقی سمجھا جائے اور خلوصِ دل سے اس کا شکر بجا لایا جائے۔ یہ شکر صرف یہی نہیں کہ زبان سے "یا اللہ تیرا شکر ہے" کہ دیا جائے بلکہ اس کی حقیقی صورت یہ ہے کہ اپنی عبادت وبندگی کا رُخ صِرف اللہ کی ذات کی طرف پھیر دیا جائے اور غیر اللہ کی عبادت وبندگی کا اپنی عملی زندگی میں کوئی شائبہ تک نہ رہنے دیا جائے۔

ہمیں یہ خوب خیال رکھنا چاہیے کہ شِرک صِرف یہی نہیں کہ پتھر یا لکڑی کے بُت بنا کر ان کو پوجا جائے بلکہ یہ بھی شرک ہے کہ ہر چھوٹی بڑی حاجت پُورا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے لَو لگائی جائے۔

ہر مشکل میں اللہ تعالیٰ ہی کو قادرِ مطلق اور مسبّب الاسباب سمجھ کر اسی کے فیض و کرم سے اپنی مجبوریوں کا حل تلاش کرنا چاہیے۔ بے شمار مسلمان ایسے ملتے ہیں جو زبانی طور پر تو اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے ہیں، لیکن عملاً اپنی اولاد، روزگار، صحت اور دیگر مسائل کو انسانوں کے سامنے اسی عاجزی اور امید سے پیش کرتے ہیں، جس کا صرف اور صرف اللہ تعالیٰ حق دار ہے۔

انسان کی اس کمزوری کا بیان اللہ تعالیٰ یوں فرماتے ہیں:۔

وَاتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ يُنْصَرُونَ ۝ لَا يَسْتَطِيعُونَ نَصْرَهُمْ وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُونَ ۝

(سورۃ یٰسٓ: ۷۴، ۷۵)

ترجمہ: اور پکڑتے ہیں اللہ کے سوائے اور حاکم کو شاید ان کی مدد کریں۔ نہ کر سکیں گے ان کی مدد اور وہ اُن کے حق میں ایک فریق ہو جائیں گے لا حاضر کیے ہوئے۔

آگے فرماتے ہیں:۔

اَمَّنْ هٰذَا الَّذِىْ يَرْزُقُكُمْ اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهٗ ج

(سورۃ المُلک: ۲۱)

ترجمہ: بھلا وہ کون ہے جو روزی دے تم کو اگر اللہ اپنی روزی بند کرے۔

انسانی زندگی پر عقیدہ توحید کے اثرات

توحید سے انسان کے فکر و عمل اور شخصیت میں نمایاں اور انقلابی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں جن میں سے چند ایک یہ ہیں:۔

۱: عِزّتِ نفس عقیدۂ توحید انسان کو عزّتِ نفس عطا کرتا ہے۔ انسان جب یہ یقین کر لیتا ہے کہ اس کا خالق و مالک اللہ ہے، وہی طاقت کا سرچشمہ ہے۔ اور وہی قادرِ مطلق ہے۔ تو اس عقیدہ کی روشنی میں انسان صِرف اللہ کے سامنے جھُکتا ہے اور اسی سے ڈرتا ہے۔ اب اس کی پیشانی انسانوں یا پتھر کی بے جان مورتیوں کے سامنے جھُکنے کی ذِلّت سے محفوظ ہو جاتی ہے۔

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

۲: اِنکسار عقیدۂ توحید سے تواضع و انکسار پیدا ہوتا ہے، کیونکہ توحید کا پرستار جانتا ہے کہ وہ اللہ کے سامنے بے بس ہے، اس کے پاس جو کچھ ہے سب اسی کا دیا ہُوا ہے۔ جو خدا تعالیٰ دینے پر قادر ہے وہ چھین لینے پر بھی قادر ہے۔ لِہٰذا بندے کے لیے تکبّر و غرور کی کوئی گنجائش نہیں۔ اسے تواضع و انکسار ہی زیب دیتا ہے۔

۳: وُسعتِ نظر عقیدۂ توحید کا قائل تنگ نظر نہیں ہوتا، کیونکہ وہ اس رحمٰن و رحیم پر ایمان رکھتا ہے، جو کائنات کی ہر چیز کا خالق اور سب جہانوں کا پالنے والا ہے۔ اس کی رحمتوں سے سب فیض یاب ہوتے ہیں۔ اس عقیدے کے نتیجہ میں مومن کی ہمدردی، محبّت اور خدمت عالمگیر ہو جاتی ہے اور وہ ساری خلقِ خدا کی بہتری کو اپنا نصب العین بنا لیتا ہے۔

۴: اِستقامت و بہادری اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے سے استقامت اور بہادری پیدا ہوتی ہے۔ مومن

جانتا ہے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور محتاج ہے۔ خدا تعالیٰ ہی کو سب پر قدرت حاصل ہے۔ لہٰذا اسی کے سامنے جھکنا چاہیے اور اسی سے ڈرنا چاہیے۔ اس عقیدے کے ذریعے مومن کے دل سے دوسروں کا خوف نکل جاتا ہے اور وہ استقامت و بہادری کی تصویر بن جاتا ہے اور کسی بڑے سے بڑے فرعون کا خوف اپنے دل میں نہیں لاتا، خواہ بدر و اُحد کی لڑائی ہو یا حُنین و خندق کی، وہ ہر جگہ لَاخَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَاھُمْ یَحْزَنُوْنَ (نہ ان پر کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمزدہ ہوتے ہیں) کا پیکر بن جاتا ہے۔

۵: رجائیت اور اطمینانِ قلب

عقیدۂ توحید کا ماننے والا مایوس اور نا امید نہیں ہوتا۔ وہ ہر وقت خدا تعالیٰ کی رحمت پر آس لگائے رکھتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ وہ بڑا رحیم و کریم ہے۔ وہ تمام خزانوں کا مالک ہے اور اس کا فضل و کرم بے حدّ و حِساب ہے۔ انسان جس قدر دل کو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کرتا ہے اُس کے دل کو اُتنا ہی اطمینان نصیب ہوتا ہے۔

۶: پرہیزگاری

عقیدۂ توحید سے انسان کے دل میں پرہیزگاری پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ ہر مومن کا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام ظاہر اور پوشیدہ باتوں کو جانتا ہے۔ اگر بندہ پوشیدگی میں کوئی جُرم کرلے تو ممکن ہے لوگوں کی نگاہوں سے چھپ جائے، مگر اپنے اللہ کی نظر سے نہیں چھپ سکتا، کیونکہ وہ تو دلوں کے ارادوں کو بھی جانتا ہے۔ یہ ایمان انسان میں یہ جذبہ پیدا کرتا ہے کہ وہ خِلوت وجَلوت میں کہیں بھی گناہ کا ارتکاب نہ کرے اور ہمیشہ نیک اعمال بجا لائے، کیونکہ معاشرہ

اسی وقت صحیح معنوں میں انسانی معاشرہ بن سکتا ہے جب لوگوں کے اعمال درست ہوں۔ توحید پر ایمان، عملِ صالح کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ کیونکہ انسان کے تمام اعمال اس کے دل کے تابع ہوتے ہیں۔ اگر دل میں ایمان کی روشنی موجود ہو تو عمل صالح ہوگا۔

نجات وفلاح کے لیے ایمان اور عمل صالح دونوں کا ہونا ضروری ہے اسی لیے قرآن مجید میں جا بجا ارشاد ہوا۔ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے) جس طرح کوئی درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اسی طرح ایمان کی پہچان عمل صالح سے ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتا ہے مگر اس کے اعمال اچھے نہیں تو یہی سمجھا جائے گا کہ ایمان نے اس کے دل کی گہرائیوں میں پوری طرح جگہ نہیں پکڑی۔ غرضیکہ عقیدۂ توحید اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ نیک اعمال بجا لائے جائیں اور بُرے اعمال سے بچا جائے۔

عقیدۂ رِسالت

اِسلام کے سلسلۂ عقائد میں توحید کے بعد رسالت کا درجہ ہے۔ رسالت کے لغوی معنی ہیں "پیغام پہنچانا" اور پیغام پہنچانے والے کو رسُول کہا جاتا ہے۔ اسلامی اصطلاح میں رسُول اس شخص کو کہا جاتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام کی تبلیغ کے لیے اپنی مخلوق کی طرف بھیجا ہو۔ رسُول کو نبی بھی کہا جاتا ہے۔ نبی کے معنی ہیں "خبر دینے والا"۔ چُونکہ رسُول لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے ارشادات سے آگاہ کرتا ہے اس لیے اسے نبی بھی کہا جاتا ہے۔ انبیا

اور رسُول اپنے معاشرہ کے بے حد نیک اور پارسا انسان ہوتے ہیں، جن پر اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے اپنے احکام نازل فرماتا ہے۔ وحی کے لُغوی معنی دل میں چُپکے سے کوئی بات ڈالنا اور اشارہ کرنے کے ہیں۔ اور اسلامی اِصطلاح میں اس سے مُراد اللہ تعالیٰ کا وہ پیغام ہے جو اُس نے اپنے کسی رسُول کی طرف فرشتے کے ذریعے نازل کیا، یا براہِ راست اس کے دل میں ڈال دیا، یا کِسی پردے کے پیچھے سے اسے سُنوا دیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ط (سورۃ الشوریٰ : ۵۱)

ترجمہ : اور یہ کسی بشر کا مقام نہیں کہ اللہ اسی سے کلام کرے۔ مگر ہاں یا تو وحی سے یا کسی پردے کے پیچھے سے یا کِسی (فرشتے) قاصد کو بھیج دے سو وہ وحی پہنچا دے اللہ کے حُکم سے جو اللہ کو منظور ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے دُنیا کی مختلف اقوام کی طرف رسُول بھیجے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا :۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا (سُورۃُ النّحل : ۳۶)

ترجمہ : اور ہم نے اُٹھائے ہیں ہر اُمت میں رسُول۔

بعض روایات میں انبیاؑ کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار بیان کی گئی

ہے۔ مگر قرآن مجید میں نام لے کر صرف چند انبیا کا ذکر کیا گیا ہے۔ تمام کے نام نہیں بیان کیے گئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ط (سورۃ المومن: ۷۸)

ترجمہ : اور ہم نے آپؐ سے پہلے بہت سے رسول بھیجے، جن میں سے بعض کا حال ہم نے آپؐ سے بیان کیا ہے اور اُن میں سے بعض کا حال ہم نے آپؐ سے نہیں بیان کیا۔

سلسلۂ انبیا کے آخری فرد حضرت محمّد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم ہیں جو خاتم النّبیّین ہیں اور اب قیامت تک کے انسانوں کو آپؐ ہی کی پیروی کرنی ہے۔ تاہم ہر مسلمان پر لازم کیا گیا ہے کہ وہ تمام انبیا کی نبوّت پر ایمان لائے۔ اس سلسلے میں تفریق کی اجازت نہیں۔

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ قف (سورۃ البقرۃ : ۲۸۵)

ترجمہ : ہم اس کے رسولوں میں باہم کوئی فرق بھی نہیں کرتے۔

یہ ضروری ہے کہ سب انبیا کو سچا اور پاکباز مانا جائے اور سب کا ادب و احترام کیا جائے۔ اسلام میں اس بات کی ہرگز اجازت نہیں کہ بعض رسولوں پر ایمان لایا جائے، اور بعض کا انکار کیا جائے۔ ایسا کرنا کفر ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ

يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ (سورۃ النساء: ۱۵۰، ۱۵۱)

ترجمہ: جو لوگ منکر ہیں اللہ سے اور اس کے رسُولوں سے اور چاہتے ہیں کہ فرق نکالیں اللہ میں اور اس کے رسولوں میں اور کہتے ہیں ہم مانتے ہیں بعضوں کو اور نہیں مانتے بعضوں کو اور چاہتے ہیں کہ نکالیں اس کے بیچ میں ایک راہ۔ ایسے لوگ وہی ہیں اصل کافر۔

رسُول کی ضرورت

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے انسانوں ہی میں سے رسُول بھیجے۔ کیونکہ انسان کی رہنمائی کے لیے انسان ہی رسُول ہوسکتا ہے۔ الٰہی پیغام کو نبیؐ پر نازل کرنے کی حکمت مندرجہ ذیل آیت میں ملاحظہ ہو:۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (سورۃ النحل: ۴۴)

ترجمہ: اور اُتاری ہم نے تجھ پر یہ یادداشت کہ تو کھول دے لوگوں کے سامنے وہ چیز جو اُتری ان کے واسطے۔

حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو خود اپنی زندگی میں قرآنی اصُولوں پر مبنی ایک عملی مُظاہرہ کرنا تھا۔ صِرف یہی نہیں کہ آکر پیغام سُنا دیتے۔ بلکہ اِس پیغام کے مُطابق اِنسانی زِندگی کی اِصلاح بھی آپؐ کی ذِمّہ داری تھی۔ پیغامِ الٰہی فرشتوں کے ذریعے سے بھی بھیجا جا

سکتا تھا۔ مگر محض پیغام بھیجنے سے وہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس عظیم مقصد کی تکمیل وتعمیل کے لیے لازمی تھا کہ اس پیغام کو بنی نوع انسان ہی کا ایک فرد لے کر آئے جو کہ انسان کامل ہونے کے باوجود بہرحال انسان اور بشر ہو۔ اس کو مشکلات اور مجبوریوں کا اسی طرح سامنا کرنا پڑتا ہو جس طرح اس کی اُمّت کے معمولی فرد کو، اور جو ساری دُنیا کے سامنے ایک ایسی سوسائٹی کو بطور مثال رکھ دے جس کا اجتماعی نظام اسی پیغام الٰہی کے منشا کی شرح ہو۔

اَنبیا کی خصُوصیّات

انبیا کی خصُوصیات مندرجہ ذیل ہیں :-

۱ : بشریّت اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی رہبری کے لیے ہمیشہ کسی انسان ہی کو پیغمبر بنا کر بھیجا۔ کسی جِنّ یا فرشتے کو نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَیْهِمْ (سُورۃ یوسف : ۱۰۹)

ترجمہ : اور جتنے بھیجے ہم نے تجھ سے پہلے وہ سب مرد ہی تھے۔

انبیا اگرچہ انسان ہوتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسے اوصاف سے نوازا ہوتا ہے جو دوسروں میں نہیں ہوتے۔ بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی تھی کہ انسان، پیغمبر نہیں ہو سکتا۔ پیغمبر تو کوئی فرشتہ ہونا چاہیے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا :-

قُلْ لَّوْ كَانَ فِی الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ یَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّیْنَ

لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا (سورۃ الاسراء : ۹۵)

ترجمہ : کہ اگر ہوتے زمین میں فرشتے پھرتے بستے تو ہم اُتارتے ان پر آسمان سے کوئی فرشتہ پیغام دے کر۔

۲ : امین

رسالت ایک ایسی نعمت ہے جو محض اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے۔ کوئی شخص اپنی محنت وکاوش سے اسے حاصل نہیں کرسکتا۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں جو محض عبادت و ریاضت سے حاصل ہو جائے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، جسے چاہے دے دے۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ط (سورۃ الجمعۃ :۴)

ترجمہ : یہ اللہ کا فضل ہے وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔

تاہم یہ منصب جن لوگوں کو عطا کیا گیا وہ تمام نیکی، تقویٰ، ذہانت اور عزم وہمت جیسی بلند صفات کے مالک تھے۔

۳ : تبلیغ احکامِ الٰہی

پیغمبر جو احکام وتعلیمات لوگوں کے سامنے بیان فرماتا ہے وہ تمام اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے ہیں۔ پیغمبر اپنی طرف سے نہیں کہتا۔ وہ تو اللہ تعالیٰ کا ترجمان ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۞ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۞ (سورۃ النجم: ۳،۴)

ترجمہ : اور نہیں بولتا اپنے نفس کی خواہش سے یہ تو حکم ہے بھیجا ہوا۔

۴ : معصومیّت اللہ تعالیٰ کے تمام پیغمبر معصوم اور گناہوں سے پاک ہوتے ہیں۔ ان کے اقوال اور اعمال شیطان کے عمل دخل سے محفوظ ہوتے ہیں۔ نبیؐ کا کردار بے داغ ہوتا ہے۔ وہ ایسا انسان کامل ہوتا ہے جو بے حد روحانی طاقت کا مالک ہوتا ہے۔ نبی کا کوئی کام نفسانی خواہشات کے تابع نہیں ہوتا۔

۵ : واجب اطاعت انبیا کی اطاعت و پیروی ضروری ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (سورۃ النساء : ٦٤)

ترجمہ : اور ہم نے جو بھی رسول بھیجا وہ اس غرض سے کہ اس کی اطاعت اللہ کے حکم سے کی جائے۔

نبی، اللہ کا راستہ دکھاتا ہے اس لیے اس کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہوتی ہے۔ اسی طرح پیغمبر کتاب اللہ کا شارح ہوتا ہے۔ امّت کا مُعلّم اور مُربّی ہوتا ہے۔ اُمّت کے لیے نمونۂ تقلید ہوتا ہے۔ قانونِ الٰہی کا شارح ہوتا ہے اور قاضی اور حَکَم ہوتا ہے۔

رسالتِ محمّدی اور اُس کی خصُوصیّات

حضرت آدم علیہ السّلام سے نبوّت کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ خاتم المُرسلین حضرت مُحمّد رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم پر آکر اپنی تکمیل کو پہنچ گیا اور ختم ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ نے

پہلے انبیائے کرام کو جو کمالات علیحدہ علیحدہ عطا فرمائے تھے، نبی آخرُ الزّمان صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی ذات میں وہ تمام شامل کر دیئے۔ رسالت مُحمّدؐی بڑی نمایاں خصوصیات رکھتی ہے، جن میں سے چند ایک یہ ہیں۔

۱: عمُومیّت رسول اکرمؐ سے پہلے آنے والے انبیاؑ کی نبوّت کسی خاص قوم یا مُلک کے لیے ہوتی تھی مگر آپؐ کی نبوّت قیامت تک کے تمام انسانوں کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

قُلْ يَآ اَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (سورۃ الاعراف: ۱۵۸)

ترجمہ: (اے مُحمّدؐ) تو کہہ اے لوگو! مَیں رسُول ہوں اللہ کا تم سب کی طرف۔

۲: پہلی شریعتوں کا نسخ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی شریعت نے آپؐ سے پہلے آنے والے انبیاؑ کی شریعتوں کو منسُوخ کر دیا۔ اب صرف شریعتِ محمّدی پر عمل کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ (آل عمران: ۸۵)

ترجمہ: اور جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کو تلاش کرے گا سو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔

۳: کاملیّت حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم پر اللہ کے دین کی تکمیل ہو گئی۔ آپؐ کو وہ دینِ کامل عطا فرمایا

گیا جو تمام انسانیت کے لیے کافی ہے۔ اس لیے کسی دوسرے دین کی اب کوئی ضرورت نہیں رہی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ (سورۃ المائدۃ : ۳)

ترجمہ: آج میں پورا کر چکا تمہارے لیے دین تمہارا اور پورا کیا تم پر میں نے احسان اپنا اور پسند کیا میں نے تمہارے واسطے اسلام کو دین۔

۴ : حفاظتِ کتاب

پہلے انبیا پر نازل ہونے والی کتابیں یا تو بالکل ناپید ہو چکی ہیں یا اپنی اصلی صورت میں باقی نہیں رہیں۔ کیونکہ ان میں بڑے پیمانے پر ردّ و بدل ہو چکا ہے۔ جس سے ان کتابوں میں صحیح اور غلط تعلیمات اس قدر گڈمڈ ہو گئی ہیں کہ صحیح کو غلط سے جُدا کرنا بے حد مشکل ہو گیا ہے۔ مگر خاتم الرّسل صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم پر نازل ہونے والی کتاب قرآن کی آیات چودہ سو سال گزرنے کے باوجود بالکل اسی صورت میں موجود ہیں جس طرح نازل ہُوئی تھیں۔ اس کے ایک حرف میں بھی تبدیلی نہیں ہُوئی۔ قرآن مجید نہ صرف یہ کہ تحریری طور پر محفوظ ہے بلکہ لاکھوں انسانوں کے سینوں میں بھی موجود ہے۔

۵ : سُنتِ نبویؐ کی حفاظت

اللہ کی طرف سے رسُول اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی سُنّت کی حفاظت کا بھی عظیم انتظام کیا گیا ہے۔ ہر دَور میں محدّثین کِرام کی ایسی جماعت موجود رہی جس نے سنّت نبوی کی حفاظت کے لیے

اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ چونکہ سُنّت، قرآنِ مجید کی شرح ہے جو قیامت تک کے انسانوں کے لیے سرچشمۂ ہدایت ہے، اس لیے اللہ نے جس طرح قرآن مجید کی حفاظت کا انتظام کیا، ساتھ ساتھ سُنّتِ نبوی کی حفاظت کا انتظام بھی فرما دیا۔

۶: جامعیّت

پہلے انبیا کی رسالت کسی خاص قوم اور دَور کے لیے ہوتی تھی۔ اس لیے ان کی تعلیمات کا تعلق اسی قوم اور دَور سے ہوتا تھا۔ مگر رسول اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم چونکہ تمام انسانیت اور تمام زمانوں کے لیے رسول بن کر آئے۔ اس لیے آپؐ کی تعلیمات میں اس قدر جامعیّت ہے کہ قیامت تک کے انسان خواہ کسی بھی قوم یا دَور سے تعلق رکھتے ہوں، ان تعلیمات سے رہبری حاصل کر سکتے ہیں۔

۷: ہمہ گیری

رسُولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے جو تعلیمات پیش فرمائیں ان کی حیثیت محض نظری نہیں رکھی بلکہ خود ان پر عمل کر کے انہیں عملی زندگی میں نافذ کر کے دکھایا۔ جب آپؐ کی حیاتِ طیّبہ پر نظر ڈالی جائے، تو معلوم ہوتا ہے کہ عائلی زندگی ہو یا سیاسی، بچّوں سے برتاؤ ہو یا بڑوں سے معاملہ، امن کا دَور ہو یا جنگ کا زمانہ، عبادت کی رسمیں ہوں یا معاملات کی باتیں، قرابت کے تعلّقات ہوں یا ہمسائیگی کے روابط، زندگی کے ہر پہلو میں سیرتِ مُحمّدیؐ انسانوں کے لیے بہترین نمونۂ عمل ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (سورۃ الاحزاب: ۲۱)

ترجمہ: تمہارے لیے اللہ کے رسولؐ (کی سیرت) میں بہترین نمونہ ہے۔

۸: ختمِ نبوّت

ختم نبوت کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے نبوّت کا جو سلسلہ شروع ہوا، اور یکے بعد دیگرے کئی انبیا آئے، کچھ کے پاس اپنی علیحدہ آسمانی کتابیں اور مستقل شریعتیں تھیں اور کچھ اپنے سے پہلے انبیا کی کتابوں اور شریعتوں پر عمل پیرا تھے۔ یہ سلسلہ حضرت محمّد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم پر آکر ختم ہوگیا۔ آپؐ پر ایک جامع اور ہمیشہ رہنے والی کتاب نازل ہوئی اور آپؐ کو ایک کامل شریعت دی گئی۔ آپؐ آخری نبی ہیں۔ آپؐ پر دین کی تکمیل ہوئی اور آپؐ کی شریعت نے پہلی تمام شریعتوں کو منسوخ کردیا۔ آپؐ کے بعد اب کسی قسم کا کوئی دوسرا نبی نہیں آئے گا کیونکہ:۔

۱: اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو تمام انسانوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے اور قیامت تک ہر قوم اور ہر دور کے انسانوں کے لیے آپؐ کی رسالت عام ہے اور سب کے لیے آپؐ کی تعلیم کافی ہے۔

۲: اللہ تعالیٰ نے آپؐ پر دین کو مکمّل کردیا۔ آپؐ کی شریعت کامل ہے، اور آپؐ کی تعلیمات، ہدایت کی مکمّل ترین شکل ہیں اس لیے اب کسی دوسرے نبی کی کوئی ضرورت نہیں۔

۳: اللہ تعالیٰ نے آپؐ پر نازل کردہ کتاب قرآن مجید کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے اور وہ کتاب چودہ سو سال گزرنے کے باوجود اِس شان سے محفوظ

ہے کہ اِس کے ایک حرف میں بھی کوئی رَدّ و بَدل نہیں ہو سکا۔ اس کتاب کا ایک ایک حرف محفوظ ہے، کاغذ کے صفحات پر بھی اور حُفّاظ کے سینوں میں بھی۔ آپؐ کی تمام تعلیمات اپنی صحیح شکل میں محفوظ ہیں جو تمام دُنیا کے لیے ہدایت کا سرچشمہ ہیں۔ اِس لیے آپؐ کے بعد کوئی اور نبی نہیں آسکتا۔ اب ہر طالِب ہدایت پر لازم ہے کہ حضرت خاتم المُرسلینؐ پر ایمان لائے اور آپؐ ہی کے بتائے ہُوئے طریقے پر چلے۔

عقیدۂ ختم نبوّت، قُرآن، حدیث اور اجماعِ اُمّت تینوں سے ثابت ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا اِرشاد ہے:۔

مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ ط (سورۃ الاحزاب : ۴۰)

ترجمہ: مُحمّدؐ باپ نہیں کِسی کا تمہارے مردوں میں سے لیکن اللہ کا رسُول ہے اور آخری نبی ہے۔

عربی زبان میں ختم کے معنی ہیں مُہر لگانا، بند کرنا، آخر تک پہنچانا، کسی کام کو پُورا کر کے فارغ ہوجانا۔ تمام مُفسّرینؒ نے اس آیت کریمہ میں خاتم کے معنی آخری نبی کے بیان کیے ہیں۔ حدیثِ مُبارک میں ہے۔ "رسُولِ خُدا نے فرمایا، بنی اسرائیل کی رہنمائی انبیا کیا کرتے تھے۔ جب ایک نبی وفات پاجاتا، تو دوُسرا نبی اس کا جانشین ہوتا۔ مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں"۔ ایک اور حدیث میں آتا ہے۔ "حضُور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے فرمایا میری اور مُجھ سے پہلے گزرے ہُوئے انبیا کی مثال ایسے ہے جیسے ایک شخص نے عمارت بنائی اور خوُب حسین وجمیل

بنائی، مگر ایک کنارے میں ایک اینٹ کی جگہ خالی چھوڑ دی اور وہ اینٹ مَیں ہوں۔

تمام صحابہ کرام رضؓ کا اس بات پر اجماع تھا کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے دَور میں جن لوگوں نے دعوٰی نبوّت کیا، صحابہ کِرامؓ نے اُن کے خلاف جہاد کیا۔

مَلائکہ

ملائکہ کا لفظ جمع ہے۔ اس کا واحد مَلک ہے۔ جِس کے لغوی معنی قاصد کے ہیں۔ فرشتوں کے لیے لفظ رَسُول بھی استعمال ہُوا ہے۔ کیونکہ اِس کے لُغوی معنی بھی قاصد کے ہیں۔ چُونکہ فرشتے خالق اور مخلُوق کے درمیان پیغام رسانی کا فرض ادا کرتے ہیں، اس لیے ان کو مَلک اور رسُول کہا جاتا ہے۔ توحید و رسالت کی طرح فرشتوں پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ (سورۃ البقرۃ: ۱۷۷)

ترجمہ: لیکن بڑی نیکی تو یہ ہے جو کوئی ایمان لائے اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور سب کتابوں پر اور پیغمبروں پر۔

فرشتے اللہ تعالیٰ کی وہ نُوری مخلُوق ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حُکم

کے مُطابق دُنیا کا نظام چلا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنا حکم ان کے دل میں القاء فرماتا ہے اور وہ اس حُکم کو مخلوق میں جاری اور نافذ کر دیتے ہیں۔

آسمانی کتابیں

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ مُسلمان ہونے کے لیے ضروری ہے کہ تمام رسُولوں پر ایمان لایا جائے۔ رسُولوں پر ایمان لانے کا مفہُوم یہ ہے، کہ انھیں اللہ تعالیٰ کا سچّا پیغمبر مانا جائے اور ان کی تعلیمات کو برحق تسلیم کیا جائے۔ رسُولوں پر نازل ہونے والی کتابیں، ربّانی تعلیمات کا مجموعہ ہوتی ہیں۔ لِہٰذا رسُولوں پر ایمان لانے کے لیے لازم ہے کہ ان پر نازل ہونے والی کتابوں پر بھی ایمان لایا جائے۔ ایمان والوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ

وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ج (سُورۃ البقرۃ : ۴)

ترجمہ: اور وہ لوگ جو ایمان لائے اس پر کہ جو کچھ نازل ہوا تیری طرف اور اس پر کہ جو کچھ نازل ہوا تجھ سے پہلے۔

کُل آسمانی کتابیں بہُت سی ہیں جن میں سے چار بہت مشہور ہیں:۔

۱ : زبُور جو حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی۔

۲ : توریت جو حضرت موسیٰ علیہ السّلام پر نازل ہوئی۔

۳ : انجیل جو حضرت عیسیٰ علیہ السّلام پر نازل ہوئی۔

۴ : قرآن مجید جو حضرت محمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم پر نازل ہوا۔

ان کے علاوہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت آدمؑ اور دوسرے انبیاؑ کے صحیفے بھی تھے۔ ان تمام کتابوں میں دین کی بُنیادی باتیں مُشترک تھیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کی توحید، اس کی صفاتِ کاملہ، اللہ تعالیٰ کی عبادت، رسالت پر ایمان، یوم آخرت پر ایمان اور اعمال کی جزا سزا۔ مگر چونکہ ہر دور میں وقت کے تقاضے مُختلف ہوتے ہیں اِس لیے شریعت کے تفصیلی قوانین ان کتابوں میں جدا جُدا تھے۔ بعد میں آنے والی کتابوں نے پہلی کتابوں کے تفصیلی قوانین کو منسوخ کر دیا۔ اسی طرح قرآن نے جو کہ سب کتابوں کے بعد نازل ہوا، پہلی تمام شریعتوں کو منسُوخ کر دیا۔ اور اب صِرف قرآن کے بتائے ہوئے قوانین پر عمل کرنا لازم ہے۔ پہلی کتابوں کے بتائے ہوئے قوانین پر نہیں۔ پہلی کتابوں پر ایمان لانے کا اب مطلب یہ ہے کہ وہ بھی سچی کتابیں تھیں اور ان کے بیان کردہ قوانین پر ان کے زمانے میں عمل کرنا ضروری تھا مگر اب صرف قرآنی ہدایات ہی پر عمل کیا جائے گا۔

آخری آسمانی کتاب

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے جو آخری پیغمبر حضرت محمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم پر نازل ہوئی اور قیامت تک کے تمام انسانوں کے لیے، یہ سرچشمۂ ہدایت ہے۔ قرآن مجید کی چند اہم خصوصیات یہ ہیں:

۱: محفوظ ہونا

چونکہ قرآن مجید قیامت تک کے ہر دَور اور ہر قوم کے انسانوں کے لیے رُشد و ہدایت کا ذریعہ ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا خاص وعدہ فرمایا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ ۝ (سُورۃ الحجر: ۹)

ترجمہ: ہم نے خود اتاری ہے یہ نصیحت اور ہم خود اس کے نگہبان ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ چودہ سو سال گزرنے کے باوجود قرآن مجید کا ایک ایک لفظ محفوظ ہے۔ اللہ کی طرف سے اس کی حفاظت کا ایسا انتظام کردیا گیا ہے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تحریف (ردّوبدل) سے محفُوظ ہوگیا ہے جب کہ دُوسری آسمانی کتابوں میں بڑا ردّ و بدل ہوچکا ہے۔ ان کا بہت سا حصّہ ضائع ہوچکا ہے، اور جو باقی بچا اس میں بھی لوگوں نے اپنی طرف سے کئی باتیں شامل کردیں۔ اب یہ کتابیں کہیں بھی اپنی اصلی شکل میں دستیاب نہیں، جب کہ قرآن مجید اپنی خالص شکل میں اب تک موجُود ہے اور ہمیشہ موجُود رہے گا۔

۲: قرآن کی زندہ زبان

قرآن مُجید جس زبان میں نازل ہُوا، وہ ایک زندہ زبان ہے۔ آج بھی دُنیا کے بیس سے زیادہ ممالک کی قومی زبان عربی ہے اور یہ زبان دُنیا کی چند بڑی زبانوں میں سے ایک ہے۔ جبکہ پہلی آسمانی کتابیں جن زبانوں میں نازل ہُوئیں وہ مُردہ ہوچکی ہیں۔ جن کو سمجھنے والے بہت ہی کم لوگ ہیں۔

۳ : عالمگیر کتاب

باقی آسمانی کتابوں کے مطالعے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ صرف کسی ایک خاص مُلک یا خاص قوم کے لوگوں کے لیے تھیں۔ مگر قرآن مجید ساری دُنیائے انسانیّت کے لیے پیغامِ ہدایت ہے۔ یہ کلامِ پاک یَاَیُّھَا النَّاسُ (اے لوگو) کا خطاب کر کے تمام انسانوں کو ہدایت کا پیغام دیتا ہے۔ یہ ایک عالمگیر کتاب ہے، جس کی تعلیمات ہر دَور اور ہر مُلک میں قابلِ عمل ہیں۔

اس کتاب کی تعلیمات فطری ہیں اس لیے کہ ہر دَور کا انسان یُوں محسُوس کرتا ہے، جیسے یہ اسی کے دَور کے لیے نازل ہُوئی ہے۔ کیونکہ اس کی تعلیمات ہر قوم و ملک اور ہر طرح کے ماحول میں بسنے والے افراد کے لیے یکساں طور پر نفع بخش اور عقل کے عین مُطابق ہیں۔

۴ : جامع کتاب

پہلی آسمانی کتابوں میں سے کچھ کتابیں صرف اخلاقی تعلیمات پر مشتمل تھیں۔ بعض صرف مناجات اور دعاؤں کا مجموعہ تھیں۔ کچھ صرف فقہی مسائل کا مجموعہ تھیں۔ بعض میں صِرف عقائد کا بیان تھا اور بعض صرف تاریخی واقعات کا مجموعہ تھیں۔ مگر قرآن مجید ایسی جامع کتاب ہے جِس میں ہر پہلُو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس میں عقائد و اعمال کا بیان بھی ہے اخلاق و روحانیت کا درس بھی ہے، تاریخی واقعات بھی ہیں اور مناجات بھی غرضیکہ یہ ایسی جامع کتاب ہے جو زندگی کے ہر پہلو میں رہنمائی کرتی ہے۔

۵: عقل وتہذیب کی تائید کرنے والی کتاب

پہلی آسمانی کتابوں میں سے بعض کتابیں ایسی باتوں پر بھی مشتمل ہیں جو حقیقت کے خلاف ہیں بلکہ بعض کتابوں میں انتہائی ناشائستہ، غیراخلاقی باتیں بھی پائی جاتی ہیں (ظاہر ہے یہ باتیں جعلی ہیں جو کسی نے اپنی طرف سے شامل کردی ہیں)، جب کہ قرآن مجید ایسی تمام باتوں سے پاک ہے۔ اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو خلافِ عقل ہو اور جسے تجربہ اور دلیل سے غلط ثابت کیا جا سکے۔ اس میں کوئی غیراخلاقی بات نہیں۔ اس نے تمام انبیا کا ادب واحترام سکھایا اور سب کے بارے میں بتایا ہے، کہ وہ نیکوکار اور پرہیزگار لوگ تھے۔ ان کی شان کے خلاف جتنی بھی باتیں کہی گئی ہیں، سب جھوٹ اور خلافِ واقعہ ہیں۔

۶: قرآن مجید کا اعجاز

قرآن مجید فصاحت وبلاغت کا وہ شاہکار ہے۔ جس کا مقابلہ کرنے سے عرب وعجم کے تمام فصیح وبلیغ لوگ عاجز رہے۔ قرآن مجید میں سب مُخالفوں کو دعوت دی گئی ہے، کہ ایک چھوٹی سی قرآنی سُورت کے مُقابلے میں کوئی سُورت بنا لاؤ مگر کوئی بھی اس کی مثال پیش نہ کرسکا۔ کیونکہ یہ تو خُدا کا کلام ہے کسی بندے کا بنایا ہوا کلام نہیں۔ پھر کوئی بشر اس کا مقابلہ کیسے کرسکتا ہے؟

آخرت

اِسلام کے بُنیادی عقائد میں سے ایک عقیدہ آخرت بھی ہے :-

مفہُوم لفظ "آخرت" کے معنی بعد میں ہونے والی چیز کے ہیں۔ اس کے مُقابلے میں لفظ "دُنیا" ہے، جِس کے معنی قریب کی چیز کے ہیں۔ عقیدۂ آخرت کا اِصطلاحی مفہُوم یہ ہے کہ انسان مرنے کے بعد ہمیشہ کے لیے فنا نہیں ہوجاتا بلکہ اس کی رُوح باقی رہتی ہے اور ایک وقت ایسا آئے گا جب اللہ تعالیٰ اس کی رُوح کو جسم میں منتقل کرکے اسے دوبارہ زندہ کردے گا اور پھر انسان کو اس کے نیک و بد اعمال کا حقیقی بدلہ دیا جائے گا۔ نیک لوگوں کو ایک ایسی جگہ عنایت کی جائے گی جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے بھرپور ہوگی۔ اس کا نام جنت ہے اور بُرے لوگ ایک انتہائی اذیّت ناک جگہ میں رہیں گے جِس کا نام جہنّم ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ ۝ وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ ۝ (سُورۃ انفطار : ۱۳، ۱۴)

ترجمہ : بے شک نیک لوگ بہشت میں ہیں۔ اور بے شک گناہ گار دوزخ میں ہیں۔

آخرت کے سلسلہ میں قرآن مجید کی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے :-

۱ : انسان کی دُنیاوی زندگی اس کی آخرت کی زندگی کا پیش خیمہ ہے۔ دُنیا کی زندگی عارضی اور آخرت کی زندگی دائمی ہے۔ انسان کے تمام اعمال کے پُورے پُورے نتائج اس عارضی زندگی میں مُرتّب نہیں ہوتے۔ بلکہ اس عارضی زندگی میں جن اعمال کا بیج بویا جاتا ہے ان کے حقیقی نتائج آخرت کی زندگی میں ظاہر ہوں گے۔

۲ : جِس طرح دُنیا کی ہر چیز علیحدہ علیحدہ اپنی ایک عُمر رکھتی ہے، جِس کے ختم ہوتے ہی وہ چیز ختم ہو جاتی ہے، اسی طرح پُورے نظامِ عالم کی بھی ایک عُمر ہے جِس کے تمام ہوتے ہی یہ نظام ختم ہو جائے گا اور ایک دُوسرا نظام اس کی جگہ لے لے گا۔

۳ : جب دُنیا کا یہ نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اور ایک دُوسرا نظام قائم ہوگا، تو انسان کو جسمانی زندگی ملے گی۔ اس روز ایک زبردست عدالت لگے گی جس میں انسان کے تمام اعمال کا حساب لیا جائے گا۔ اسے نیک اعمال کی جزا ملے گی اور بُرے اعمال کی سزا ملے گی۔

مُنکرینِ آخرت کے شبہات اور اُن کا قُرآنی جواب

قرآن مجید میں عقیدۂ آخرت کو بیان کرتے ہُوئے مُنکرین کے

شبہات کا بڑے عمدہ انداز میں جواب دیا گیا ہے۔

مشرکین مکہ عقیدۂ آخرت کے منکر تھے، اس سلسلے میں ان کے شبہات یہ تھے۔

وَقَالُوٓا ءَ اِذَا ضَلَلْنَا فِی الْاَرْضِ ءَ اِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ ۬ؕ (سورۃ السّجدۃ : ۱۰)

ترجمہ: اور کہتے ہیں کیا جب ہم زمین میں نیست ونابود ہوں گے۔ توکیا کہیں پھر ہم نئے جنم میں آئیں گے۔

مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَهِیَ رَمِیْمٌ ○ (سورۃ یٰس : ۷۸)

ترجمہ: کون زندہ کرے گا ہڈیوں کو جب کہ وہ بوسیدہ ہوگئی ہوں۔

لہٰذا

اِنْ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِیْنَ ○

(سورۃ الانعام : ۲۹)

ترجمہ: ہمارے لیے زندگی نہیں مگر یہی دُنیا کی اور ہم کو پھر نہیں زندہ ہونا۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے شبہات کو دُور کرتے ہُوئے فرمایا۔ تم پہلے موجود نہ تھے۔ تمہیں اللہ نے موجُود کیا، جو قادرِ مطلق تمہیں پہلے موجُود کرنے پر قادر ہے۔ وہ تمہارے مرجانے کے بعد تمہیں دوبارہ زندگی بخشنے پر بھی قادر ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ یَبْدَءُوا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ (سُورۃ الرّوم : ۲۷)

ترجمہ: اور وُہی ہے جو پہلی بار پیدا کرتا ہے اور وہی دوبارہ پیدا کرے گا

قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ (سُورہ یٰسٓ: ۷۹)

ترجمہ: تو کہہ ان کو زندہ کرے گا جس نے بنایا ان کو پہلی بار۔

كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ○ (سُورۃ البقرۃ: ۲۸)

ترجمہ: حالانکہ تم بے جان تھے۔ پھر جِلایا تم کو پھر مارے گا تم کو پھر جِلائے گا تم کو پھر اُسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

انسان کی صحیح سوچ اس سے عقیدۂ آخرت پر ایمان لانے کا تقاضا کرتی ہے۔ ہر شخص اِس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ نیک عمل کا اچھا صلہ اور بُرے عمل کا بُرا بدلہ ہوتا ہے۔ لیکن کیا انسان کے تمام اعمال کے نتائج اس دُنیاوی زندگی میں سامنے آجاتے ہیں؟ ایسا نہیں ہوتا، بلکہ بعض اوقات ایک ایسا شخص جس نے پُوری زندگی گناہوں میں گذاری ہو اس جہان میں سزا سے بچا رہتا ہے۔ اسی طرح بعض بے حد نیک لوگ جو عمر بھر نیکیاں کرتے رہے انہیں یہاں نیکی کا پُورا بدلہ نہ ملا بلکہ بعض کو تو بے حد اذیّتیں دے کر شہید کر دیا گیا۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے۔ کیا مُجرموں کو ان کے جرائم کی سزا کبھی نہیں ملے گی؟ کیا نیکوکار اچھے اجر سے محرُوم رہیں گے؟ کیا خدا کا نظامِ عدل ان کے بارے میں ہمیشہ کے لیے خاموش رہے گا؟ کیا اشرف المخلوقات انسان کو عبث پیدا کیا گیا

اور اس کے اعمال کی کوئی قدر و قیمت نہیں؟

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا
وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ○ (سورۃ المومنون : ۱۱۵)

ترجمہ: سو کیا تم خیال رکھتے ہو کہ ہم نے تم کو بنایا بے مقصد اور تم ہمارے پاس پھر کر نہ آؤ گے۔

جب عقل اس پہلو پر سوچتی ہے تو یہ بات تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ آخرت کی زندگی برحق ہے جس میں سب لوگوں کو اُن کے اعمال کی جزا و سزا ملے گی۔ نیک لوگوں کو ان کے اعمال کا بہت اچھا بدلہ ملے گا اور مجرموں کو سخت سزا ملے گی، سوائے ان کے جن کو اللہ تعالیٰ معاف فرما دے۔

اسلام میں عقیدۂ آخرت کی اہمیت

آخرت پر ایمان رکھنا اسلام کی نہایت اہم تعلیم ہے۔ قرآن مجید میں اس کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ سورہ بقرہ میں متقین کی تعریف کرتے ہوئے ارشاد ہوا۔ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں)

اگر آخرت پر ایمان نہ ہو تو انسان خود غرضی اور نفس پرستی میں ڈوب کر تہذیب و شرافت اور عدل و انصاف کے تقاضوں کو یکسر بھول جائے اور انسانی معاشرے میں جنگل کا قانون رائج ہو جائے۔

عقیدۂ آخرت انسانی معاشرہ کو انسانیت افروز بنانے کا اہم ذریعہ ہے۔ کیونکہ اس سے انسان کے دل میں نیکی پر جزا اور بدی پر سزا کا

احساس اُبھرتا ہے جو اعمال میں صالحیت پیدا کردیتا ہے۔

جو شخص آخرت کی زندگی پر ایمان رکھتا ہے اس کی نظر اپنے اعمال کے صرف ان ہی نتائج پر نہیں ہوتی جو اس زندگی میں ظاہر ہوتے ہیں۔ بلکہ وہ ان نتائج پر بھی نظر رکھتا ہے جو آخرت کی زندگی میں ظاہر ہوں گے۔ اسے جس طرح زہر کے بارے میں ہلاک کرنے اور آگ کے بارے میں جلانے کا یقین ہوتا ہے۔ اسی طرح گناہوں کے ہلاکت خیز ہونے کا بھی یقین ہو جاتا ہے اور جس طرح وہ غذا اور پانی کو اپنے لیے مفید سمجھتا ہے اسی طرح نیک اعمال کو بھی اپنے لیے نجات و فلاح کا سبب سمجھتا ہے۔ عقیدۂ آخرت کے انسانی زندگی پر بڑے اہم اثرات مُرتّب ہوتے ہیں جن میں سے چند یہ ہیں۔

۱: نیکی سے رغبت اور بدی سے نفرت

جو شخص آخرت پر یقین رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ اس کے تمام اعمال خواہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ۔ اس کے نامۂ اعمال میں محفوظ کر لیے جاتے ہیں۔ آخرت میں یہی نامۂ اعمال اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش ہوگا اور منصفِ حقیقی فیصلہ فرمائے گا۔ ان اعمال کا وزن کیا جائے گا۔ ایک پلڑے میں نیک اعمال اور دوسرے میں بُرے اعمال ہوں گے۔ اگر نیکی کا پلڑا بھاری ہُوا تو کامیابی حاصل ہوگی، اور جنّت میں ٹھکانہ نصیب ہوگا اور اگر بُرائیوں کا پلڑا بھاری ہوا تو ناکامی ہوگی اور جہنّم کا دردناک عذاب چکھنا ہوگا۔

آخرت پر ایمان رکھنے والا شخص بُرائیوں سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ کیونکہ اسے علم ہوتا ہے کہ ان کے نتیجہ میں وہ عذاب میں

مبتلا ہوسکتا ہے۔ اسے نیکیوں سے محبت ہو جاتی ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اسے نیکی کا اجر ضرور ملے گا۔

۲: بہادری اور سرفروشی

ہمیشہ کے لیے مٹ جانے کا ڈر انسان کو بُزدل بنا دیتا ہے۔ مگر جب دل میں یہ یقین موجود ہو کہ اس دنیا کی زندگی چند روزہ ہے، پائیدار اور دائمی زندگی آخرت کی ہے تو انسان نڈر ہو جاتا ہے۔ وہ اللہ کی راہ میں جان قربان کرنے سے بھی نہیں کتراتا۔ وہ جانتا ہے کہ راہِ حق میں جان کا نذرانہ پیش کر دینے سے وہ ہمیشہ کے لیے فنا نہیں ہو جائے گا۔ بلکہ آخرت کی کامیاب اور پُرمسرّت زندگی حاصل کرے گا۔ چنانچہ یہ عقیدہ مومن کے دل میں جذبۂ سرفروشی پیدا کر کے مُعاشرے میں امن اور نیکی کے پھیلنے کی راہیں ہموار کر دیتا ہے۔

۳: صبر و تحمُّل

عقیدۂ آخرت سے انسان کے دل میں صَبر و تحمّل کا جذبہ پَیدا ہوتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ حق کی خاطر جو بھی تکلیف برداشت کی جائے گی اس کا اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر ملے گا۔ لِہٰذا آخرت پر نظر رکھتے ہُوئے وہ ہر مصیبت کا صبر و تحمّل سے مقابلہ کرتا ہے۔

۴: مال خرچ کرنے کا جذبہ

عقیدۂ آخرت انسان کے دل میں یہ جذبہ پیدا کرتا ہے کہ حقیقی زندگی صرف آخرت کی زندگی ہے۔ لِہٰذا اسی دولت سے لگاؤ رکھنا چاہیے جو اس زندگی کو کامیاب بنائے۔ چنانچہ مومن جتنا بھی دولت مند ہو جاتا ہے اسی قدر زیادہ سخاوت اور فیاضی کرتا ہے

کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے اس کی آخرت
کی زندگی سنور جائے گی۔

۵ : احساسِ ذمّہ داری

آخرت پر ایمان رکھنے سے انسان
میں احساسِ ذمّہ داری پیدا ہو
جاتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اپنے فرائض میں کوتاہی کرنا جُرم ہے
جِس پر آخرت میں سزا ملے گی۔ لِہٰذا پُوری ذمّہ داری سے اپنے فرائض
ادا کیے جائیں۔ آہستہ آہستہ یہ احساس اس قدر پُختہ ہو جاتا ہے
کہ انسان اپنا ہر فرض پُوری دیانت داری سے سرانجام دینے لگتا ہے خواہ
اس کا تعلّق بندوں کے حقوق سے ہو یا خُدا کے حقُوق سے۔

سوالات

۱ : اسلام کے بنیادی عقائد کون کون سے ہیں۔ ہر ایک پر مختصر نوٹ لکھیں۔

۲ : وجود باری تعالیٰ کے اثبات میں قرآن نے جو دلائل دیے ہیں، مختصراً لکھیے۔

۳ : شرک کسے کہتے ہیں اور اس کی اقسام کے متعلّق آپ کیا جانتے ہیں؟

۴ : انبیائے کرام کی خصوصیات بیان کریں۔

۵ : مندرجۂ ذیل پر مختصر نوٹ لکھیں:۔

۱ : ملائکہ ۲ : آسمانی کتابیں ۳ : توحید کا مفہوم

۶ : انسانی زندگی پر عقیدۂ توحید کے اثرات بیان کریں۔

۷ : رسالتِ مُحمّدی کی خصوُصیّات تفصیل سے بیان کریں۔

۸ : قرآن مجید کی چند اہم خصوُصیّات لکھیں۔

۹ : آخرت کے سلسلہ میں قرآن مجید کی تعلیمات کا خلاصہ تحریر کریں۔

۱۰ : انسانی زندگی پر عقیدۂ آخرت کے کیا اثرات مُرتّب ہوتے ہیں؟

باب دُوم

اِسلامی تشخُّص

ارکانِ اسلام

ارکان اسلام سے مُراد دین کے وہ بنیادی اصُول و اعمال ہیں جن پر اسلام کی پُوری عمارت قائم ہے۔ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشادِ گرامی ہے:۔

"بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ شَهَادَةِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِیْتَآءِ الزَّکٰوةِ وَالْحَجِّ وَصَوْمِ رَمَضَانَ"

(بُخاری۔ مسلم)

ترجمہ: اسلام کی عمارت پانچ ستونوں پر اُٹھائی گئی ہے، اس بات کی شہادت کہ اللہ کے سوا کوئی معبُود نہیں اور یہ کہ حضرت مُحمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم اللہ کے بندے اور اس کے (آخری) رسُول ہیں اور نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا اور حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔

کلمۂ شہادت: ارکانِ دین میں سب سے اہم کلمۂ شہادت

ہے، جس کے الفاظ ہیں :-

أَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ
وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ

ترجمہ: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ یکتا ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور میں اس بات کی بھی گواہی دیتا ہوں کہ مُحمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم اُس کے بندے اور اس کے (آخری) رسُول ہیں۔

توحید کے باب میں تفصیل سے بیان ہو چکا ہے کہ عقیدۂ توحید کے انسانی زندگی پر کیا اثرات مُرتّب ہوتے ہیں۔ یہاں چند اجمالی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے :-

کفر و شرک سے نجات
کلمۂ شہادت کا پہلا حصّہ یعنی أَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ

عقیدۂ توحید کا ہی اعلان و اعتراف ہے۔ کلمۂ شہادت کا دوسرا حصّہ یعنی أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اس امر کا اعلان ہے کہ حضرت مُحمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم خداوند قدوس کے بندے اور سچے رسُول ہیں اور آپؐ کا پیش کردہ دین ہی دینِ حق ہے۔ ان دونوں باتوں کی گواہی کے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا۔ گو بظاہر توحید و رسالت دو باتیں ہیں، لیکن دراصل دونوں ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ نہ اللہ تعالیٰ کو مانے بغیر کوئی شخص رسُولؐ کو مان سکتا ہے اور نہ رسولؐ کو تسلیم کیے بغیر اللہ تعالیٰ کو پہچان سکتا ہے (چونکہ رسُولؐ پر ایمان لانے کے مفہوم میں ان کی بتلائی

قائم کرنے والے فلاح پائیں گے اور اسے ترک کرنے والے ذلّت و خواری کا شکار ہوں گے۔ ایک آیت میں مذکور ہے کہ جب عذاب کے فرشتے جہنمیوں سے عذاب پانے کی وجہ دریافت کریں گے تو وہ اپنے جہنّم میں پھینکے جانے کی ایک وجہ یہ بتائیں گے۔

قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ۝ (سورۃ المدّثّر: ۴۳)

ترجمہ: وہ بولے ہم نہ تھے نماز پڑھتے۔

دل و زبان سے اللہ کو معبود تسلیم کرنے کے بعد اس کے سب سے اہم حکمِ نماز کی ادائیگی سے انحراف ایک طریقے سے خدا تعالیٰ کو معبود ماننے سے انکار کے برابر ہے۔ اِس لیے نبی کریمؐ نے فرمایا۔

مَنْ تَرَكَ الصَّلٰوةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ (ترمذی)

ترجمہ: جِس نے جان بوجھ کر نماز چھوڑی، اُس نے کافرانہ روش اختیار کی۔

نماز قربِ خداوندی کا سب سے مؤثّر وسیلہ ہے۔ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے:۔

اِنَّ اَحَدَكُمْ اِذَا صَلّٰى يُنَاجِىْ رَبَّهٗ (بخاری)

ترجمہ: جب تم سے کوئی نماز پڑھتا ہے تو گویا اپنے رب سے چپکے چپکے با۔ چیت کرتا ہے۔

اسی اہمیت کے پیشِ نظر قیامت کے روز سب سے پہلے نماز کا

حساب ہو گا۔ نبی کریمؐ نے فرمایا :۔

اَوَّلُ مَا سُئِلَ ، سُئِلَ عَنِ الصَّلوٰةِ

ترجمہ : قیامت کے روز سب سے پہلے نماز کا حساب لیا جائے گا۔

نماز کے فوائد

۱ : اللہ تعالیٰ کے سامنے بندہ کی دن میں پانچ بار حاضری اس کے دل میں یہ احساس تازہ رکھتی ہے کہ وہ اپنے اللہ کا بندہ ہے۔ بندگی کا یہ احساس متواتر نماز پڑھنے سے ایک مُسلمان کی فطرتِ ثانیہ بن جاتا ہے۔ اور اس کی پُوری زندگی تعمیلِ احکام کا عملی نمونہ بن جاتی ہے۔

۲ : دن میں پانچ مرتبہ قُربِ خداوندی کا احساس مُسلمان کو یقین دلاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر وقت اس کے ساتھ ہے۔ وہ کبھی خود کو تنہا محسوس نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہونے کا احساس اسے گناہ کے کاموں سے روکتا اور اس کے دل سے ہر قسم کا خوف اور غم دُور کرتا ہے۔

۳ : نمازوں کے درمیانی وقفے میں بھی نمازوں کے اثرات جاری و ساری رہتے ہیں۔ نماز کے بعد گناہ کا خیال آئے تو بندہ سوچتا ہے کہ ابھی تو اپنے اللہ سے دُعا کر کے آیا ہُوں کہ گناہوں سے بچا، اور ابھی گناہ کا کام کروں گا تو کچھ دیر بعد اس کے سامنے کیا مُنہ لے کر جاؤں گا۔ یہ چیز اسے مستقلاً گناہ سے روکے رکھتی ہے۔

۴ : خدا تعالیٰ کی عبادت اور اس کی خوشنودی کے حصول کے سلسلے میں پانچ بار، باہم ملنے والے افراد کے درمیان محبّت و یگانگت پیدا ہوتی ہے، جس سے سب کو فائدہ پہنچتا ہے۔

۵ : نماز باجماعت اور بطورِ خاص جمعے اور عیدین کی نمازوں سے مسلمانوں میں اجتماعیت کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ جب مسلمان رنگ، نسل، علاقے اور طبقے کے امتیازات سے بے نیاز ہو کر شانے سے شانہ ملا کر ایک امام کے پیچھے کھڑے ہوتے ہیں تو اس سے ان کے درمیان فکری وحدت کے ساتھ ساتھ عملی مساوات کا احساس بھی پیدا ہوتا ہے۔

۶ : اجتماعی شکل میں انجام پانے والے اعمال کی کیفیات، انفرادی اعمال کے مقابلے میں زیادہ مؤثر ہوتی ہیں۔ اسی لیے اجتماعی نماز کا ثواب انفرادی نماز کے مقابلے میں ستائیس گُنا زیادہ ہوتا ہے۔

۷ : نمازیوں کو مسجد میں آتے جاتے دیکھ کر بے نمازوں کو ترغیب و تحریص ہوتی ہے اور وہ بھی نماز کی طرف متوجّہ ہو جاتے ہیں۔

۸ : نماز میں امام کا تقرّر اور اس کی پیروی، اجتماعی نظم و ضبط کا شعور پیدا کرتی ہے۔ نبی اکرم ؐ نے تو نماز باجماعت کے لیے مسجد میں نہ پہنچنے والے افراد کے لیے فرمایا تھا کہ جو لوگ نماز کے لیے مسجد میں نہیں آتے۔ اگر مجھے ان کے بیوی بچوں کا خیال نہ ہوتا تو میں ان کے گھروں میں آگ لگوا دیتا۔

بے رُوح نمازیں

نماز کی ادائیگی کے متذکرہ بالا فوائد و ثمرات آج ہمیں کیوں حاصل نہیں ہوتے؟ غور فرمائیے! ہم میں سے، کتنے افراد ہیں جو نماز باقاعدگی سے پڑھتے ہیں؟ اس کے کلمات و اوراد کے معنی و مفہوم سے آشنا ہیں؟ نماز میں حضوری قلب سے بہرہ مند ہیں؟ اور نماز کے اہم ترین مقصد سے بخوبی آگاہ ہیں؟

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ (سورۃ العنکبوت: ۴۵)

ترجمہ: بے شک نماز روکتی ہے بے حیائی اور بُری بات سے۔

درحقیقت آج ہماری نمازیں بے مقصد ہیں۔ ایسے ہی جیسے کوئی پھُول ہو، بغیر خوشبو کے! یا قالب ہو، بغیر رُوح کے۔

روزہ

روزہ اسلام کا چوتھا بُنیادی رکن ہے اور قرآن حکیم کے بیان کے مُطابق یہ پہلی امتوں پر بھی فرض رہا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ (سورۃ البقرۃ: ۱۸۳)

ترجمہ: اے ایمان والو، فرض کیا گیا تم پر روزہ جیسے فرض کیا گیا تھا تم سے اگلوں پر تاکہ تم پرہیزگار ہو جاؤ۔

مذکورہ بالا آیت سے جہاں روزے کا فرض ہونا ثابت ہوتا ہے،

وہاں اس کو فرض کرنے کی حکمت بھی معلوم ہوتی ہے اور وہ ہے تقوٰی کا حصُول !

تقوٰی

تقوٰی کا مفہوم پرہیزگاری ہے۔ تقوٰی دل کی اس کیفیت کا نام ہے، جو انسان کو برائیوں سے روکتی اور نیکیوں کی طرف راغب کرتی ہے۔

ضبطِ نفس

انسان کو نیکی کے راستے سے روکنے، اور برُائی کے راستے پر ڈالنے والی اہم چیز خواہشِ نفس ہے۔ خواہشات اگر اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تابع رہیں تو انسان کی انفرادی اور اجتماعی خوبیوں کے فروغ کا سبب بنتی ہیں۔ لیکن جب یہ ہدایتِ ربّانی کے تابع نہیں رہتیں، تو انسان کو حیوانی سطح سے بھی گرا دیتی ہیں۔ روزے کا اصل مقصد انسان کی خواہشات کو احکامِ الٰہی کے تابع کرکے اسے متّقی بنانا ہے۔ جو شخص ہر سال ایک مہینہ تک، اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر اپنی بنیادی خواہشات پر قابو پانے کی مشق کامیابی سے مکمّل کرلے، اسے ضبطِ نفس کی وہ قوّت حاصل ہوجاتی ہے، جِس سے وہ شیطان کی ہر ترغیب کا آسانی سے مقابلہ کرسکتا ہے۔

جب ایک انسان رمضان کے پُورے مہینے میں کھانے، پینے اور نفسانی خواہشات پر قابو رکھتا ہے نیز دیگر اخلاقی برُائیوں سے اِجتناب کرتے ہُوئے اپنا اکثر وقت عبادات اور نیک کاموں میں گزارتا ہے تو اس کی طبیعت میں نیکی کا ذوق پیدا ہوجاتا ہے اور بدی سے اسے نفرت ہوجاتی ہے۔ روزہ خواہشات پر قابو پانے کی تربیت کے ساتھ ساتھ انسان کی انانیت (خُود پسندی) کا بھی مُوثّر علاج ہے۔

جب انسان بھوک اور پیاس کی شدّت میں، کھانے پینے کی اشیاء پاس ہوتے ہوئے بھی خود کو کھانے پر قادر نہیں پاتا تو اسے خدا تعالیٰ کے سامنے اپنی بے چارگی کا احساس ہوتا ہے اور یہ احساس جب دائمی کیفیت بن جائے تو اس میں ہر خلافِ شریعت عمل سے رُک جانے کی صلاحیت پیدا کر دیتا ہے۔ نبی اکرمؐ نے جہاں ارشاد فرمایا ہے "ایمان اور احتساب کے ساتھ رکھے گئے روزوں سے پچھلے تمام گناہ معاف ہوجاتے ہیں" وہاں یہ بھی فرمایا ہے۔ "بہُت سے روزے دار ایسے ہیں کہ جن کو اپنے روزوں سے بھوک اور پیاس کی اذیّت کے سوا کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔" اسی طرح آپؐ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ:۔

مَنْ لَّمْ یَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِہٖ فَلَیْسَ لِلّٰہِ حَاجَۃٌ فِیْ اَنْ یَّدَعَ طَعَامَہٗ وَ شَرَابَہٗ (بخاری)

ترجمہ: اگر کوئی شخص روزہ رکھ کر بھی جھوٹ اور غلط کاریوں سے نہیں بچتا تو اس کا کھانا پینا چھڑا نے سے اللہ کو کوئی دلچسپی نہیں۔

روزوں کا ثواب

جو روزے نبی اکرمؐ کے قول کے مُطابق ایمان اور احتساب کے ساتھ رکھے جائیں، ان کے ثواب کا اندازہ درج ذیل حدیثوں سے ہوگا۔

"کُلُّ عَمَلِ ابْنِ اٰدَمَ یُضَاعَفُ الْحَسَنَۃُ بِعَشْرِ اَمْثَالِھَا اِلٰی سَبْعِ مِائَۃِ ضِعْفٍ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی اِلَّا الصَّوْمُ فَاِنَّہٗ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ" (مُسلم)

ترجمہ : آدمی کے ہر عمل کا ثواب (خدا تعالیٰ کے یہاں) دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک ہو جاتا ہے (لیکن روزے کی تو بات ہی کچھ اور ہے) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مگر روزہ تو خاص میرے لیے ہے۔ اس لیے اس کا ثواب میں اپنی مرضی سے جتنا (چاہوں گا)، دوں گا۔

مَنْ فَطَّرَ فِيْهِ صَآئِمًا كَانَ مَغْفِرَةً لِّذُنُوْبِهٖ وَعِتْقُ رَقَبَتِهٖ مِنَ النَّارِ وَكَانَ لَهٗ مِثْلُ اَجْرِهٖ مِنْ غَيْرِ اَنْ يَّنْتَقِصَ مِنْ اَجْرِهٖ شَيْئًا

(سنن ابن ماجہ۔ ترمذی)

ترجمہ : جو شخص اس (رمضان) میں کسی روزے دار کو افطار کروائے گا اس کے گناہوں کے لیے معافی ہے اور وہ خود کو نارِ جہنم سے بچالے گا اور اسے روزے دار جتنا ہی ثواب ملے گا۔ جبکہ اس روزے دار کے اپنے ثواب میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔

روزے کے اجتماعی فوائد

یوں تو روزہ ایک انفرادی عبادت ہے، لیکن اس کے درج ذیل اجتماعی فوائد بھی ہیں۔

١ : مہینہ بھر بھوکا پیاسا رہ کر انسان کو دوسرے کی بھوک پیاس کا احساس ہوتا ہے اور دل میں ناداروں کے لیے ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

٢ : کم سے کم غذا پر اکتفا کی عادت، انسان میں قناعت و ایثار کی صفات پیدا کرتی ہے۔

۳: ایک ہی وقت میں پوری ملّت اسلامیہ کا ایک عبادت میں مصروف رہنا، باہمی یگانگت کے فروغ کا سبب بنتا ہے۔ اس اعتبار سے نبی اکرمؐ نے ماہِ رمضان کو مواسات اور غمگساری کا مہینہ قرار دیا ہے۔

۴: ایک ماہ تک دن کے بڑے حصے میں معدے کا خالی رہنا صحت جسمانی کے لیے مفید ہوتا ہے۔

رمضان المبارک اور قرآنِ حکیم

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ ط (سورۃ البقرۃ : ۱۸۵)

ترجمہ: مہینہ رمضان کا ہے جس میں نازل ہوا قرآن، ہدایت ہے واسطے لوگوں کے اور دلیلیں روشن، سو جو کوئی پائے تم میں سے اس مہینہ کو تو ضرور روزے رکھے اس کے۔

نزولِ قرآن کی یادگار

اس مہینے میں روزوں کی فرضیت یہ معنی رکھتی ہے کہ انسان جب تک روزوں کے ذریعے تقویٰ حاصل نہ کرے۔ وہ اس کتاب پاک سے جو متقیوں کے لیے ہدایت ہے، کما حقہٗ فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

رمضان اور پاکستان

یوں تو رمضان المبارک پوری دُنیا کے مسلمانوں کے لیے رحمت و مغفرت کا

مہینہ ہے لیکن ہم پاکستانی مسلمانوں کے لیے اس مہینہ اور اس کی ایک مبارک شب کی خاص اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس مبارک رات میں ہمیں آزادی عطا فرمائی تھی۔ رمضان کی ستائیسویں شب کو پاکستان کی تشکیل گویا اس حقیقت کی طرف اشارہ تھا کہ اس مملکت خداداد میں اسی کتاب مقدس کا نظام زندگی نافذ کیا جائے جو اس مبارک شب میں نازل ہوئی اور ہم نے پاکستان کا مطالبہ کیا بھی اسی غرض سے تھا کہ یہاں اسلامی نظامِ حیات نافذ کیا جائے۔ اس اعتبار سے رمضان المبارک، تشکیل پاکستان کی سالگرہ اور خدا سے کیے ہوئے ہمارے عہد کی تجدید کا بھی موقع ہے۔

بے اثر روزے آج ہمارے روزوں کے وہ فیوض وبرکات ظاہر نہیں ہوتے جن کا ہم اوپر کی سطور میں تذکرہ کر چکے ہیں۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہم روزے کے اصل مقصد تقوٰی (ضبطِ نفس) سے بے خبر ہیں۔ اس کی اہم شرائط، ایمان اور احتساب، دونوں سے غافل ہیں۔ جس طرح ہماری نمازیں دکھاوے کی ہیں، ویسے ہی ہمارے روزے نمائشی ہیں۔

زکوٰۃ انسانی معاشرے کی تشکیل میں نظامِ معیشت بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو نظامِ معاشرت کی طرح نظامِ معیشت کے بھی بہترین ضابطے عطا فرمائے ہیں۔ اگر ان ضابطوں پر عمل کیا جائے تو معاشی عدل قائم رہتا ہے اور ان کو ترک کر دینے سے ناانصافی جنم لیتی ہے۔ جو متعدد خرابیوں کا باعث بنتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ معاشی نظام میں زکوٰۃ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ زکوٰۃ کی اہمیت کا اندازہ کچھ اس سے بھی ہوتا ہے، کہ قرآن میں اکثر مقامات پر ادائیگیِ نماز کے ساتھ ہی ادائیگیِ زکوٰۃ کا بھی حکم دیا گیا ہے۔ نماز اگر بدنی عبادت ہے تو زکوٰۃ مالی عبادت ہے۔ نظامِ زکوٰۃ کی اسی حیثیت کے پیشِ نظر حضرت ابوبکر رض نے زکوٰۃ سے انکار کرنے والوں سے، باوجودیکہ وہ کلمہ گو تھے، جہاد کیا اور فرمایا کہ میں اپنی زندگی میں ان دونوں فرائض کی تعمیل میں کوئی فرق نہیں ہونے دوں گا۔

زکوٰۃ کے لُغوی معنی پاک کرنے کے ہیں۔ جو انسان زکوٰۃ ادا کرتا ہے، وہ خُدا کے حکم کے مُطابق نہ صِرف اپنے مال کو پاک کرلیتا ہے، بلکہ اس کے ذریعے اپنے دل کو بھی دولت کی ہوس سے پاک کرتا ہے اور دولت کے مقابلے میں اس خُدا کی محبت کو اپنے دل میں جگہ دیتا ہے جِس کے حکم پر وہ دولت کو قربان کررہا ہے۔ ادائیگی زکوٰۃ اسے یہ بھی یاد دلاتی ہے کہ جو دولت وہ کماتا ہے وہ حقیقت میں اس کی ملکیت نہیں، بلکہ خدا تعالیٰ کی دی ہُوئی امانت ہے۔ یہ احساس اسے معاشی بے راہ روی سے بچاتا اور اس کے تمام اعمال کو احکامِ الٰہی کا تابع کرتا ہے۔

نبی اکرم ص کے ارشاد کے مُطابق معاشی معاملات دین کا اہم حصہ ہیں۔ جب انسان دولت جیسی نعمت اللہ تعالیٰ کے حکم پر خرچ کرتا ہے تو خدا تعالیٰ اس کے ایثار کی قدر کرتے ہُوئے اس خرچ شدہ مال کو اپنے ذمے قرض قرار دیتا ہے اور وعدہ فرماتا ہے کہ بندے کا یہ قرض وہ کئی گنا بڑھا کر واپس کرے گا۔ ارشاد ربّانی ہے:۔

اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَیَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِیْمٌ ۙ (سورۃ التغابن : ۱۷)

ترجمہ: اگر قرض دو اللہ کو اچھی طرح پر قرض دینا وہ دُونا کرے اس کو تمہارے لیے اور تم کو بخشے اور اللہ قدر دان ہے اور تحمل والا۔

اس کے مقابلے میں جو لوگ زکوٰۃ ادا نہیں کرتے ان کے لیے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَالَّذِیْنَ یَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا یُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ۙ (سورۃ التوبہ : ۳۴)

ترجمہ: اور جو لوگ گاڑھ کر رکھتے ہیں سونا اور چاندی اور اس کو خرچ نہیں کرتے اللہ کی راہ میں سو ان کو خوش خبری سُنا دے عذاب دردناک کی۔

ان آیات کی رُو سے زکوٰۃ کی ادائیگی انسان کے لیے آخرت کی نعمتوں کے حصول اور عذابِ جہنم سے نجات کا ذریعہ ہے جس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں ہوسکتی۔

معاشی فوائد

۱: چُونکہ سُودی نظامِ معیشت میں محنت کے مقابلے میں سرمایہ کی افادیت کہیں زیادہ ہے۔ اس لیے محنت کش اور کارکن طبقہ مُسلسل غریب سے غریب تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور سرمایہ دار مختلف طریقوں سے اس کی دولت ہتھیاتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح معاشی نظام مفلوج ہو کر رہ جاتا ہے۔ زکوٰۃ اس صورتِ حال کا بہترین حل ہے۔ اس نظام کے ذریعے دولت کا ایک دھارا

امیر طبقے سے غریب طبقے کی جانب بھی مُڑجاتا ہے۔ جس سے غریب کی معاشی حالت بہتر ہو جاتی ہے۔ اس حقیقت کو قرآن حکیم ان الفاظ میں بیان کرتا ہے :۔

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ ط (سورۃ البقرۃ: ۲۷۶)

ترجمہ : مٹاتا ہے اللہ سُود کو اور بڑھاتا ہے خیرات کو :

۲ : ادائیگیِ زکوٰۃ کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ زکوٰۃ کے ذریعے پیدا ہونے والی کمی کو پُورا کرنے کے لیے صاحبِ مال اپنی دولت کسی نہ کسی منفعت بخش کاروبار میں لگانے پر مجبور ہو جاتا ہے جس سے سرمایہ کاری میں اضافہ ہوتا ہے۔ چونکہ زکوٰۃ کی شرح صرف اڑھائی فیصد ہے، لہٰذا صاحبِ مال یہ رقم دیگر قسم کے بھاری ٹیکسوں کے مقابلے میں خوش دلی اور دیانت داری سے ادا کرتا ہے۔ اور اپنا سرمایہ پوری آزادی سے کاروبار میں لگاتا ہے، جب کہ بھاری ٹیکسوں کی ادائیگی کے خوف سے سرمایہ چھپانے کا رجحان بڑھتا ہے، جس سے ملکی معیشت کمزور ہو جاتی ہے۔

معاشرتی فوائد

۱ : معاشرے میں دولت کی وہی حیثیت ہوتی ہے جو انسانی جسم میں خُون کی۔ اگر یہ سارا خون دل (یعنی مالدار طبقے) میں جمع ہو جائے تو پورے اعضائے جسم (یعنی عوام)، کو مفلوج کر دینے کے ساتھ ساتھ خود دل کے لیے بھی مُضر ثابت ہوگا۔ اگر ایک طرف مفلس طبقہ، ناداری کے مصائب سے دوچار ہوگا، تو دوسری طرف صاحبِ ثروت طبقہ دولت کی فراوانی

سے پیدا ہونے والے اخلاقی امراض (مثلاً عیاشی، آرام کوشی اور فکرِ آخرت سے غفلت شعاری) کا شکار ہو جائے گا۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں ان دونوں طبقوں میں حسد اور حقارت کے علاوہ کوئی اور رشتہ باقی نہیں رہے گا۔ بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ کشیدگی بڑھتی ہی جائے گی، اور کسی نہ کسی بہانے ضرور رنگ لا کر رہے گی۔

ان تمام انفرادی و اجتماعی فوائد کے پیش نظر، حضرت محمّد مصطفیٰ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو مدینے کی اسلامی ریاست کے قیام کے فوراً بعد یہ ہدایت کی گئی۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا

(سورۃ التوبہ: ۱۰۳)

ترجمہ: لے ان کے مال میں سے زکوٰۃ کہ پاک کرے تو ان کو اور بابرکت کرے تو ان کو اس کی وجہ سے۔

زکوٰۃ کے مصارف

تقسیم زکوٰۃ کی مدّات بھی اللہ تعالیٰ نے خود متعین فرما دی ہیں۔ ارشاد خداوندی ہے:

اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ (سورۃ التوبہ: ۶۰)

ترجمہ: زکوٰۃ تو صرف غریبوں اور محتاجوں اور کارکنوں کا حق ہے جو اُس پر مقرر رہیں نیز اُن کا جن کی دِل جوئی منظور رہے۔ اور زکوٰۃ کو صرف کیا جائے گردنوں کے چھڑانے میں اور قرض داروں کے قرضہ ادا کرنے میں اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں کی امداد میں۔ یہ سب فرض ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ بڑا علم والا ہے بڑا حکمت والا ہے۔

۱: ان تنگ دست لوگوں کی اعانت جن کے پاس کچھ نہ ہو۔

۲: ان لوگوں کی اعانت جو زندگی کی بنیادی ضرورتوں سے محروم ہیں۔

۳: زکوٰۃ کی وصولی پر متعین عملے کی تنخواہیں۔

۴: ان لوگوں کی اعانت جو نومسلم ہوں، تاکہ ان کی تالیفِ قلب ہو سکے۔

۵: غلاموں اور ان لوگوں کو آزاد کرنے کے مصارف جو قید و بند میں ہوں۔

۶: ایسے لوگوں کے قرضوں کی ادائیگی جو نادار ہوں۔

۷: جہاد فی سبیل اللہ اور تبلیغ دین میں جانے والوں کی اعانت میں۔

۸: مسافر جو حالت سفر میں مالکِ نصاب نہ ہو، گو مکان پر دولت رکھتا ہو۔

جب اسلامی نظامِ حکومت قائم ہو تو اجتماعی زکوٰۃ دینا لازم ہو گا البتہ اگر کسی خطۂ زمین میں مسلمان غیر اسلامی حکومت کے زیرِ فرمان آجائیں، تو اس صورت میں تنظیموں یا باہمی تعاون کے دوسرے اداروں کے ذریعے زکوٰۃ ادا کی جانی چاہیے۔

مسائلِ زکوٰۃ

زکوٰۃ ان لوگوں پر فرض ہے جن کے پاس ایک خاص مقدار میں سونا، چاندی، روپیہ یا سامانِ تجارت ہو۔ اس خاص مقدار کو نصاب کہتے ہیں۔ مختلف اشیاء کا نصاب یہ ہے:۔

۱ : سونا۔ ساڑھے سات تولے

۲ : چاندی۔ ساڑھے باون تولے۔

۳ : روپیہ، پیسہ اور سامان تجارت۔ سونے چاندی دونوں میں سے کسی ایک کی قیمت کے برابر۔

زکوٰۃ کسی مال پر اس وقت واجب ہوتی ہے جب اسے جمع کیے ہُوئے پُورا ایک سال گزر چکا ہو۔

ادائیگی زکوٰۃ کے چند اصول (مسائل)

۱ : زکوٰۃ صرف مسلمانوں ہی سے لی جاتی ہے۔

۲ : وہ عزیز و اقارب جن کی کفالت شرعاً فرض ہے۔ (مثلاً ماں، باپ بیٹا، بیٹی، شوہر، بیوی وغیرہ) انہیں زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی۔ البتہ دُور کے عزیز، غیروں کے مُقابلے میں قابلِ ترجیح ہیں۔

۳ : عام حالات میں ایک بستی کی زکوٰۃ خود اسی بستی میں تقسیم ہونی چاہیے۔ البتہ اس بستی میں مستحق زکوٰۃ کے نہ ہونے، یا کسی دُوسری بستی میں ہنگامی صُورتِ حال، مثلاً سیلاب، زلزلہ قحط وغیرہ کے مواقع پر زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔

۴ : زکوٰۃ دینے والوں کو چاہیے کہ زکوٰۃ لینے والے کے مستحق زکوٰۃ ہونے کا مُمکن حد تک اطمینان کرلیں۔

۵ : زکوٰۃ کی رقم سے ضرورت کی اشیاء بھی خرید کر دی جاسکتی ہیں۔

۶ : مستحق زکوٰۃ کو بتانا بھی ضروری نہیں کہ یہ پیسہ یا مال زکوٰۃ کا ہے۔

الحمدُ للہ ! ہمارے مُلک میں نظامِ زکوٰۃ کا آغاز ہو چکا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ اس کی کامیابی کے لیے ہر مُمکن تعاوُن کریں۔ تاکہ اس کی برکت سے ہمارا معاشرہ دُنیا کے لیے مشعل راہ بن سکے۔

زکوٰۃ کے جملہ فوائد و ثمرات تبھی ظاہر ہو سکتے ہیں جب ہر صاحبِ مال اللہ جلّ شانہٗ کی خوشنودی کو اپنا لائحۂ عمل بنائے اور اسلام کے فیض رسانی اور نفع بخشی کے جذبہ کو ملحُوظِ خاطر رکھّے۔ خصوصًا زکوٰۃ کی وصُولی اور تقسیم کا نظام اجتماعی قائم و دائم ہو۔

حج

ارکان اسلام میں حج کی اہمیّت کا اندازہ قرآن مجید کی اس آیت کریمہ سے بخوبی ہوتا ہے۔

وَلِلّٰہِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ؕ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (سُورۃ آل عمران : ۹۷)

ترجمہ : اور اللہ کا حق ہے لوگوں پر حج کرنا اس گھر کا جو شخص قدرت رکھتا ہو اس کی طرف راہ چلنے کی اور جو نہ مانے تو پھر اللہ پرواہ نہیں رکھتا جہان کے لوگوں کی۔

مُراد یہ ہے کہ یہ جامع عبادت، اللہ تعالیٰ کی خاطر فرض کی گئی ہے، اور اس کا اپنے بندوں پر یہ حق بھی ہے، لیکن اس سے اللہ تعالیٰ کی کوئی اپنی غرض وابستہ نہیں۔ بلکہ اس کے ذریعے بندوں کو فائدہ پہنچانا مقصود ہے۔ ادائیگی حج کا سب سے بڑا فائدہ گناہوں کی بخشش ہے۔ نبی اکرمؐ نے فرمایا:-

مَنْ حَجَّ لِلّٰهِ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ

رَجَعَ كَيَوْمٍ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ (بخاری)

ترجمہ: جو کوئی اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں حج کرتا ہے اور دورانِ حج فسق و فجور سے باز رہتا ہے۔ وہ گناہوں سے اس طرح پاک ہو کر لوٹتا ہے گویا ابھی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہو۔

اپنے گناہ گار بندوں کو دُنیا ہی میں پاک صاف کر دینے کا یہ انتظام جہاں اللہ تعالیٰ کے کرم کی دلیل ہے، وہیں اس سے فائدہ نہ اُٹھانا حد درجہ کی ناشکری اور بدبختی ہے۔ حضرت مُحمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے:-

مَنْ لَمْ يَمْنَعْهُ حَاجَةٌ ظَاهِرَةٌ أَوْ سُلْطَانٌ

جَائِرٌ أَوْ مَرَضٌ حَابِسٌ فَلَمْ يَحُجَّ فَلْيَمُتْ

إِنْ شَاءَ يَهُودِيًّا وَّإِنْ شَاءَ نَصْرَانِيًّا

ترجمہ: جس (صاحب استطاعت) شخص کو نہ کوئی ظاہری ضرورت، حج سے روک رہی ہو، نہ کوئی ظالم بادشاہ اس کی راہ میں حائل ہو اور نہ

کوئی روکنے والی بیماری اسے لاحق ہو اور پھر بھی وہ حج کیے بغیر مر جائے تو وہ ایک مسلمان کی نہیں، کسی یہودی یا نصرانی کی موت مرے گا۔

جامعیت

حج جیسی عبادت میں باقی تمام عبادات کی رُوح شامل ہے۔ حج کے لیے روانگی سے واپسی تک دورانِ سفر نماز کے ذریعے قربِ خداوندی میسّر آتا ہے۔ حج کے لیے مال خرچ کرنا زکوٰۃ سے مشابہت رکھتا ہے۔ نفسانی خواہشات اور اخلاقی بُرائیوں سے پرہیز اپنے اندر روزے کی سی کیفیت رکھتا ہے۔ گھر سے دُوری اور سفر کی صعوبت میں جہاد کا رنگ ہے۔ اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضہ سے روایت ہے کہ رسُول اکرمؐ نے فرمایا "سب سے افضل جہاد حج مبرور (مقبُول) ہے۔" آپؐ کے اسی ارشاد گرامی کے پیش نظر حضرت عُمر رضہ فرمایا کرتے "حج کا سامان تیار رکھو کہ یہ بھی ایک جہاد ہے۔"

زائرین خانہ کعبہ کی کیفیات

اگر حج کے مناسک پر غور کیا جائے، تو معلوم ہوگا کہ ہر مرحلہ اپنے اندر اخلاقی و روحانی تربیت کا سامان رکھتا ہے۔ جب ایک شخص اپنے عزیز و اقارب کو چھوڑ کر اور دُنیوی دلچسپیوں سے منہ موڑ کر، دو اَن سلی چادریں اوڑھ کر "لبّیك اللّٰھم لبّیك" کی صدائیں بلند کرتے ہُوئے بیت اللہ شریف میں حاضر ہوتا ہے، تو اس کا یہ سفر ایک طرح سے سفرِ آخرت کا نمونہ بن جاتا ہے۔

اس دینی ماحول اور پاکیزہ فضا میں جب وہ مناسکِ حج ادا کرتا ہے تو اس کی حالت ہی عجیب ہوتی ہے۔ میدانِ عرفات کے

قیام میں اسے وہ بشارت یاد آتی ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کی صورت میں مسلمانوں پر اپنی نعمت تمام فرمائی ہے۔ اسے حضور اکرمؐ کے مُبارک خُطبے کی بے مثال ہدایات یاد آتی ہیں۔ اسے یہ حکم یاد آتا ہے کہ میرے بعد گمراہی سے بچنے کے لیے قرآن اور حدیث کو مضبوطی سے تھامے رہنا۔ قربانی کرتے وقت حضرت ابراہیمؑ کی بے نظیر قربانیاں یاد آتی ہیں۔ وہ سوچتا ہے جملہ قربانیوں کے مُقابلے میں نفس کی چھوٹی موٹی خواہشات کی قربانی کی حقیقت ہی کیا ہے؟ میرا تو مرنا جینا بھی خُدا ہی کے لیے ہونا چاہیے۔ ایسے میں اس کے لبوں پر یہ کلمات، جاری ہوتے ہیں۔

اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ لَاشَرِیْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ (سورۃ الانعام : ۱۶۲ : ۱۶۳)

ترجمہ: کہ میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور مرنا اللہ ہی کے لیے ہے جو پالنے والا سارے جہان کا ہے۔ کوئی نہیں اس کا شریک اور یہی مجھ کو حکم ہُوا اور میں سب سے پہلے فرمانبردار ہُوں۔

مقامِ منیٰ میں وہ اس عزم کے ساتھ اپنے ازلی دشمن شیطان کو کنکریاں مارتا ہے کہ اب اگر یہ میرے اور میرے اللہ کے درمیان حائل ہونے کی کوشش کرے گا تو اسے پہچاننے میں غلطی نہیں کروں گا۔ جب وہ بیت اللہ کے سامنے پہنچتا ہے تو اس کی رُوح اس خیال سے وجد میں آجاتی

ہے، کہ جس گھر کی زیارت کی تمنّا تھی، وہ آج نظر کے سامنے ہے۔ خدا سے لَو لگائے رکھنے کی یہ کیفیّت حاجی کے کام آتی ہے۔ طواف کے بعد وہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرتا ہے۔ تو گویا زبانِ حال سے کہتا ہے کہ اے اللہ! تیرے قرب سے حاصل ہونے والی اس قوّت ایمانی کو میں تیرے دین کی سربلندی کے لیے وقف کردوں گا اور عمر بھر حضرت مُحمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کروں گا۔ دل کی یہی تمنّا دُعا بن کر اس طرح لبوں تک آتی ہے:-

اَللّٰھُمَّ اسْتَعْمِلْنِیْ بِسُنَّۃِ نَبِیِّکَ وَ تَوَفَّنِیْ عَلٰی مِلَّتِہٖ وَاَعِذْنِیْ مِنْ مُّضِلَّاتِ النَّفْسِ۔

ترجمہ: اے میرے اللہ! مجھے اپنے نبی کے طریقے پر کاربند رکھ اور اس پر عمل کرتے ہُوئے مجھے اپنے پاس بلالے۔ اور نفسانی لغزشوں سے مجھے محفوظ فرما دے؛

فوائد

۱: حج کا اصل فائدہ یادِ الٰہی اور تقربِ خُداوندی ہے۔ لیکن دیگر ارکانِ دین کی طرح اس کے بھی متعدّد معاشرتی و اخلاقی فوائد ہیں۔ اس موقع پر دنیا کے مختلف علاقوں سے آنے والے افراد حج کی برکت سے پاک صاف ہو جاتے ہیں یہ لوگ اپنے ساتھ ایمان اور تقویٰ کی پاکیزگی کی جو دولت لے کر لوٹتے ہیں ان کے ماحول کی بھی اصلاح کا سبب بن جاتی ہے۔

۲: حج کا یہ عظیم الشان اجتماع ملّتِ اسلامیہ کی شان و شوکت

کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ جب دُنیا کے گوشے گوشے سے آئے ہوئے مسلمان، رنگ و نسل، قوم و وطن کے امتیازات سے بلند و بالا ہو کر ایک ہی کلمہ لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ دُہراتے ہیں۔ ایک ہی کیفیت میں سرشار اپنے خُدا کی پکار پر لپکے جا رہے ہوتے ہیں تو گویا وہ خُدا کے فداکار سپاہیوں کی ایک فوج معلوم ہوتے ہیں۔

۳: حج کا ایک اہم تجارتی اور اقتصادی فائدہ یہ بھی ہے کہ مختلف ممالک سے آنے والے حجاج خرید و فروخت کے ذریعے معاشی نفع حاصل کرتے ہیں۔

حج مقبُول حج کے مذکورہ بالا اجتماعی و انفرادی فوائد سے ہم تبھی متمتع ہو سکتے ہیں۔ جب ہمارا مقصد رضائے الٰہی ہو۔ ہماری سرگرمیوں کا مرکز و محور دینِ حق کی سربلندی ہو اور حج کے روحانی مقاصد پر نظر جمی رہے۔ تبھی ہمارا حج، حجِ مقبول و مبرور ہو سکتا ہے۔

جہاد

جہاد جہاد کے لغوی معنی کوشش کے ہیں اور دینی اصطلاح میں اس سے مراد وہ کوشش ہے جو دین کی حفاظت اور فروغ اور اُمّت مُسلِمہ کے دفاع کے لیے کی جائے۔ اللہ تعالیٰ کو اس دنیا کا حاکم مان لینے کا تقاضا یہ ہے کہ ہر مُسلمان اپنی زندگی کے جملہ معاملات

میں اس کے احکام کی پیروی کرے۔ نیز اس کے مُقابلے میں کسی اور کا حُکم نہ چلنے دے۔ اگر کوئی طاقت "اقتدار اعلیٰ" اپنے ہاتھ میں لے کر اپنا قانون نافذ کرنا چاہے تو وہ جان پر کھیل کر اس کا مقابلہ کرے۔ اسلام کی جُملہ عبادات اِنسان میں یہی جذبۂ فداکاری پیدا کرنے کا ذریعہ ہیں۔ اس جذبے کے بغیر نہ اسلام کی بقا ممکن ہے، نہ فروغ۔

جہاد کی چند اقسام مندرجۂ ذیل ہیں۔

۱ : خواہشِ نفس کے خلاف جہاد : اطاعتِ الٰہی سے روکنے والی پہلی قوّت انسان کی اپنی خواہشات ہیں، جو ہر وقت اس کے دل میں موجزن رہتی ہیں، اور اسے ان کی سرکوبی کے لیے ہر وقت چَوکنا رہنا پڑتا ہے۔ لِہٰذا خواہشاتِ نفس کے خلاف جہاد کو نبی اکرمؐ نے "جہادِ اکبر" کا نام دیا ہے اور یہ جہاد کا وہ مرحلہ ہے جسے سَر کیے بغیر انسان جہاد کے کِسی اور میدان میں کامیابی حاصل نہیں کرسکتا۔

۲ : شیطان کے خلاف جہاد : اپنے نفس پر قابو پالینے کے بعد ان شیطانوں سے نمٹنا ضرُوری ہوتا ہے جو اللہ کے بندوں کو اپنی اطاعت اور بندگی پر مجبور کر رہے ہوں۔ قرآن حکیم اس قسم کی ہر قوّت کو طاغوت کا نام دیتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ (سُورۃ النساء: ۷۶)

ترجمہ: جو لوگ ایمان والے ہیں سو لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں اور جو کافر ہیں

سو لڑتے ہیں شیطان کی راہ میں۔

یہ طاغوتی قوتیں مسلمان معاشرے کے اندر غلط رسم ورواج کی شکل میں بھی پائی جاتی ہیں۔ اور اسلامی معاشرے کے باہر غیر اسلامی ممالک کے غلبے کی شکل میں بھی۔ چنانچہ ان طاغوتی طاقتوں سے نمٹنے کے طریقے بھی مختلف ہیں۔ کہیں ان سے زبان وقلم کے ذریعے نمٹا جاتا ہے، اور کہیں قوت وطاقت کے ذریعے۔ اس بارے میں قرآن مجید ایک جامع ہدایت دیتا ہے۔

وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ط (سورۃ النحل: ۱۲۵)

ترجمہ: اور اُن کے ساتھ بحث کیجیے پسندیدہ طریقہ سے۔

اگر جہاد کا سچا جذبہ دل میں موجزن ہو تو مومنانہ بصیرت ہر موقع پر مناسب راہیں سُجھا دیتی ہے۔ اس سلسلے میں نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا یہ فرمان بہترین رہنمائی کرتا ہے۔

مَنْ رَأَی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ وَذٰلِکَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ (مسلم)

ترجمہ: تم میں سے جو کوئی بدی کو دیکھے تو اس کو ہاتھ سے (قوت سے) روکے۔ اگر اس کی قدرت نہ رکھتا ہو تو زبان سے اور اگر اس کی بھی قدرت نہ رکھتا ہو تو اسے دل سے بُرا سمجھے (اور یہ بدی کو محض دل سے بُرا سمجھنا)

ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔

جہاد بالسّیف حق و باطل کی کشمکش میں وہ مقام آکر رہتا ہے، جب طاغوتی قوتیں حق کا راستہ روکنے اور اسے مٹانے کے لیے سرد جنگ سے آگے بڑھ کر کھُلی جنگ پر اُتر آتی ہیں اور مُسلمانوں کو مِلّی تحفّظ اور بقائے دین کے لیے ان سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ اس کی دو اقسام ہیں:-

اوّل۔ مُدافعانہ جہاد: اگر کوئی غیر مُسلم قوت کسی مُسلمان مُلک پر حملہ کردے تو اس مُلک کے مسلمانوں پر اپنے دین و ایمان، جان و مال اور عزّت و آبرو کے تحفّظ کی خاطر جہاد فرض ہوجاتا ہے۔ مُسلمان ممالک اور اسلامی معاشرے کو غیر مسلموں کے تسلّط سے محفوظ رکھنے کے سلسلے میں جو بھی کوشش کی جائے گی، وہ جہاد شمار ہوگی۔ مُدافعانہ جہاد کی ایک قسم یہ ہے کہ اگر کسی غیر مسلم ریاست کی مُسلمان رعایا پر محض اس کے مُسلمان ہونے کی وجہ سے ظلم وستم ڈھایا جارہا ہے تو عالمِ اسلام اسے ظلم وستم سے نجات دلانے کی ہر ممکن کوشش کرے۔

دُوم۔ مُصلحانہ جہاد: جو شخص کلمہ طیبہ پڑھ کر اللہ کی حاکمیت اور نبی اکرمؐ کی اطاعت کا اقرار کرتا ہے، اس پر لازم آتا ہے کہ وہ ساری دُنیا میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور نبی اکرمؐ کی شریعت نافذ کرنے کے لیے کوشاں رہے۔ اللہ تعالیٰ نبی اکرمؐ کی بعثت کا ایک اہم مقصد دین حق کا قیام بتاتا ہے:-

هُوَ الَّذِیٓ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ

لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝ (سورۃ التوبہ: ۳۳)

ترجمہ: اُس نے بھیجا اپنے رسُول کو ہدایت اور سچا دین دے کر تا کہ اس کو غلبہ دے ہر دین پر اور پڑے بُرا مانیں مُشرک۔

مزید برآں ارشادِ خداوندی ہے۔

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ (سورۃ الانفال: ۳۹)

ترجمہ: اور لڑتے رہو ان سے یہاں تک کہ نہ رہے فساد اور ہو جاوے حکم سب اللہ کا۔

جنگ اور جہاد

مُخالفین اسلام ہمارے دین کے خلاف پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ یہ دین تلوار کے زور سے پھیلا، لیکن حقیقت میں ایسا نہیں۔ مسلمان کی تلوار اور کافر کی شمشیر، دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ کافر کی جنگ کا مقصد کسی مخصُوص فرد، گروہ یا قوم کی ہوسِ ملک گیری، جذبہ برتری یا معاشی غلبے کے جذبے کی تسکین ہوتا ہے۔ اس مقصد کے حصُول کے لیے وہ ہر ممکن ظلم، دہشت گردی اور سفاکی سے کام لیتا ہے اور کامیاب ہو جانے کی صُورت میں مفتوحین کی جان و مال اور عزت و آبرو، ہر چیز کو غارت کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس مُسلمان کے جہاد کا مقصد انسانوں کو طاغوتی قوتوں کے غلبے سے نجات دلانا، ان کے شرف اور ان کی آزادی کو بحال کرنا ہے اس مقصد کے لیے وہ خود کو اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ ضابطہ جنگ کا پابند رکھتا ہے جس میں اس کی ذاتی منفعت کا شائبہ تک شامل نہیں ہوتا۔

اس کی تلوار کی زد محض برسرِ جنگ افراد تک محدود رہتی ہے اور پھر جب وہ فتح حاصل کرتا ہے تو مفتوح قوم کو اپنے جذبۂ انتقام کا نشانہ بنانے کے بجائے ان کے لیے امن و سلامتی کی فضا فراہم کرتا ہے اور انہیں اسلام کی ان برکات سے بہرہ ور کرتا ہے، جس میں بحیثیتِ انسان تمام انسانوں کے حقوق یکساں ہیں۔ چنانچہ جب غیر مُسلم رعایا کو مسلمانوں کا نظامِ عدل، نظامِ اخلاق، نظامِ سیاست و حکومت اور نظام عبادات پسند آجاتا ہے تو وہ حلقہ بگوشِ اسلام ہو جاتے ہیں اور ان کی اس ذہنی تبدیلی کا سہرا تلوار کے سر نہیں۔ بلکہ اِسلامی تعلیمات اور مجاہدینِ اسلام کے اعلیٰ کردار کے سَر ہے۔ تلوار کا کام تو صِرف اتنا ہے کہ اسلام کے عادلانہ نظام اور عالمِ اِسلام کے درمیان جو لادینی قوتیں رُکاوٹ بنی پڑی ہوں ان کا صفایا کر دے۔

جہاد کے فضائل

قرآن حکیم اور کتبِ احادیث میں جہاد کے متعدّد فضائل بیان ہُوئے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

اِنَّ اللهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝ (سُورۃ الصّفّ: ۴)

ترجمہ: اللہ چاہتا ہے ان لوگوں کو جو لڑتے ہیں اس کی راہ میں قطار باندھ کر گویا وہ دیوار ہیں سیسہ پلائی ہُوئی۔

حضرت مُحمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے۔ "قسم ہے اللہ کی جس کی مُٹھّی میں مُحمّد کی جان ہے۔ اللہ کی راہ میں

جہاد کرنے کے لیے ایک صبح یا ایک شام کا سفر دُنیا وما فیہا کی نعمتوں سے بڑھ کر ہے، اور اللہ کی راہ میں دُشمن کے مقابل آکر ٹھہرے رہنے کا ثواب گھر میں ستّر نمازوں سے زیادہ ہے۔" بلاشبہ یہ جہاد کی عظمت اور شہادت کی تڑپ ہی کا جذبہ تھا کہ قرونِ اولیٰ کے مسلمان دُنیا پر چھائے رہے اور پُورے کرۂ ارض پر ان کی عظمت و شوکت کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔

اللہ تعالیٰ اور رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی محبّت و اطاعت

اللہ تعالیٰ کے احسانات

اللہ تعالیٰ نے ہمیں صِرف زندگی ہی نہیں دی بلکہ زندگی بسر کرنے کے تمام لوازم بھی عطا فرماتے ہیں، اس کی عنایت کا شمار اور اس کے کرم کا حساب ممکن نہیں جیسا کہ قرآن کریم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (سُورۃ ابراہیم: ۳۴)

ترجمہ: اور اگر گنو احسان اللہ کے نہ گن سکو۔

کیسے ممکن ہے کہ نعمتوں کی یہ کثرت و فراوانی انسان کے دل میں اپنے رحیم و کریم آقا کے لیے وہ جذبۂ محبّت و احسان مندی نہ پیدا

کرے جس کے بارے میں قران حکیم کہتا ہے۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ ط (سورۃ البقرہ : ۱۶۵)

ترجمہ : اور جو ایمان والے ہیں وہ تو اللہ کی محبّت سب سے قوی رکھتے ہیں۔

رسُول اللہؐ کے احسانات

اللہ تعالیٰ کے بعد ہماری محبت کے مُستحق اس کے رسُول مُحمّد مُصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپؐ کی ذات بابرکات ہے، جن کی محنتوں کے طفیل ہمیں اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت، دولتِ دین میسّر آئی۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ اللہ کی راہ میں جس قدر تکالیف مُجھے دی گئیں کسی اور نبی کو نہیں دی گئیں۔ اور وہ سب تکالیف آپؐ نے اس غرض سے برداشت کیں کہ امت آخرت کی تکالیف سے بچ جائے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی محبّت کے بارے میں ارشاد نبویؐ ہے :-

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ

مِنْ وَّالِدِہٖ وَوَلَدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ

ترجمہ : تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اسے اپنے والدین، اپنی اولاد اور دنیا کے تمام لوگوں سے زیادہ میں محبوب نہ ہو جاؤں۔

شرطِ محبّت۔ اطاعتِ رسُول

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مُتعدد مقامات پر

اطاعت رسولؐ کا حکم دیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے :-

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (سورۃ آل عمران : ۳۱)

ترجمہ : تو کہہ اگر تم محبت رکھتے ہو اللہ کی تو میری راہ چلو تاکہ محبت کرے تم سے اللہ۔

اور اطاعت کی یہ شرط کچھ ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ساتھ مخصوص نہیں۔ قرآن حکیم کہتا ہے، جتنے انبیاؑ بھی دنیا میں بھیجے گئے ان کی بعثت کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ لوگوں سے ان کی پیروی کرائی جائے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (سورۃ النساء : ۶۴)

ترجمہ : اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس واسطے کہ اس کا حکم مانا جائے اللہ کے فرمانے سے۔

ایک حدیث میں آتا ہے کہ حوضِ کوثر پر ایسے لوگوں کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار سے محروم کر دیا جائے گا، جنھوں نے مسلمان ہوتے ہوئے آپؐ کی پیروی کرنے کی بجائے دین میں نئی نئی باتیں نکال لی تھیں۔ ایک اور حدیث میں آتا ہے۔

كُلُّ اُمَّتِىْ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ اَبٰى قِيْلَ وَمَنْ اَبٰى ؟ قَالَ مَنْ اَطَاعَنِىْ دَخَلَ الْجَنَّةَ وَ

مَنْ عَصَانِی فَقَدْ اَبٰی

ترجمہ: میرا ہر امتی جنت میں جائے گا۔ سوائے اس کے جو انکار کردے
عرض کیا گیا کہ انکار کرنے والا شخص کون ہوگا؟ ارشاد فرمایا جو شخص
میری اطاعت کرے گا وہ جنت میں جائے گا اور جو میری نافرمانی کرے گا وہ
انکار کرنے والا ہوگا۔

حقُوق العباد

معاشرتی زندگی میں اگر فرداً فرداً سب لوگوں کو ان کے جائز حقوق
ملتے رہیں تو وہ سکون و اطمینان کے ساتھ اپنی صلاحیّتیں معُاشرے کی ترقّی
کے لیے استعمال کر سکتے ہیں اور اس طرح خوشگوار ماحول بن سکتا ہے، جسے
حُسنِ معاشرت کہا جا سکتا ہے، جب کہ آپس میں ایک دُوسرے کا حق
مارنے کی روش بے چینی اور کشمکش پیدا کرتی ہے۔ اس سے معاشرے کا
نظم بگڑتا ہے اور تخریبی رجحانات تعمیری صلاحیّتوں کو مفلوج کر دیتے ہیں۔
اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں انسان کو اپنی ہدایات سے محرُوم نہیں رکھا۔
اُس نے انسانوں کے درمیان حقُوق کا واضح تعیّن کرکے ان کی ادائیگی کو
اپنی خُوشنُودی اور ادا نہ کرنے کو اپنی ناخُوشی کا سزاوار ٹھہرایا۔ چنانچہ
ایک سچّا مُسلمان حقُوق العباد کو بھی حقُوق اللہ ہی کی طرح محترم سمجھتا
اور ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے۔

والدین کے حقوق

مُعاشرے میں انسان کو جن ہستیوں سے سب سے زیادہ مدد ملتی ہے وہ والدین ہیں، جو محض اس کے وجود میں لانے کا ذریعہ ہی نہیں بنے بلکہ اس کی پرورش اور تربیت کا بھی سامان ہوتے ہیں۔ دُنیا میں صرف والدین ہی کی ذات ہے جو اپنی راحت اولاد کی راحت پر قربان کر دیتی ہے۔ ان کی شفقت، اولاد کے لیے رحمتِ باری کا وہ سائبان ثابت ہوتی ہے، جو انہیں مشکلاتِ زمانہ کی دھوپ سے بچا کر پروان چڑھاتی ہے۔ انسانیت کا وجود خدا کے بعد والدین ہی کا مرہُونِ منت ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں متعدد مقامات پر اپنے بعد انھی کا حق ادا کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وَقَضٰی رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ؕ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْكِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ○ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ○ (سورۃ الاسراء : ۲۳، ۲۴)

ترجمہ: اور حُکم کر چکا تیرا رب کہ نہ پوجو اس کے سوائے اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو اگر پہنچ جائیں تیرے سامنے بڑھاپے کو ایک ان میں

سے یا دونوں تو نہ کہہ ان کو ہُوں ! اور نہ جھڑک ان کو۔ اور کہہ ان سے بات ادب کی اور جُھکا دے ان کے آگے کندھے عاجزی کر کر، نیازمندی سے۔ اور کہہ اے رب ان پر رحم کر جیسا پالا انہوں نے مُجھ کو چھوٹا سا۔

حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا کہ والدین کا نافرمان فرد جنّت کی خوشبُو سے بھی محرُوم رہے گا۔ نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے بُوڑھے والدین کی خدمت پر بہُت زور دیا ہے، کیونکہ وہ اپنی زندگی کی صلاحیّتیں اور توانائیاں اولاد پر صَرف کر چُکے ہوتے ہیں۔ اس لیے اولاد کا فرض ہے کہ ان کے بڑھاپے کا سہارا بن کر احسان شناسی کا ثبوت دے۔ ایک بار آپؐ نے صحابہ کرامؓ کی محفل میں ارشاد فرمایا۔ "ذلیل و خوار ہُوا۔ ذلیل و خوار ہوا۔ ذلیل و خوار ہُوا۔" صحابہ کرامؓ نے دریافت کیا۔ "کون؟ یارسُول اللہؐ! ارشاد فرمایا۔" وہ جِس نے اپنے ماں باپ کو یا ان میں سے کِسی ایک کو بڑھاپے کی حالت میں پایا، پھر ان کی خدمت کر کے جنت حاصل نہ کر لی۔

اولاد کے حقُوق

حضورؐ کی تشریف آوری سے پہلے کی تاریخ پر نظر ڈالو تو معلوم ہو گا کہ ایک زمانے میں انسان کی سنگ دلی اس درجے کو پہنچ گئی تھی کہ وہ اپنی اولاد کو قتل کر ڈالتا۔ اِسلام نے انسان کے دل میں سوئے ہوُئے جذبۂ رحم و الفت کو جگایا تو دُنیا سے قتلِ اولاد کی سنگدلانہ رسم مٹی اور اولاد کو اپنے والدین سے مَحبّت و شفقت کی نعمت ایک بار پھر ملی۔ قرآن حکیم میں معاشرے کی دیگر بُرائیوں کے ساتھ قتلِ اولاد سے بھی ان الفاظ میں منع فرمایا۔

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ○ (سورۃ الاسراء : ۳۱)

ترجمہ : اور نہ مار ڈالو اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے۔ ہم روزی دیتے ہیں ان کو اور تم کو بے شک ان کا مارنا بڑی خطا ہے۔

ایک صحابیؓ نے نبی اکرمؐ سے دریافت کیا کہ یارسُول اللہ! سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا۔ "شِرک"۔ انہوں نے دریافت کیا۔ "اس کے بعد" آپؐ نے فرمایا۔ "والدین کی نافرمانی"۔ عرض کیا "اس کے بعد" ارشاد ہُوا۔ "تم اپنی اولاد کو اس خوف سے مار ڈالو کہ وہ تمہارے کھانے میں حصہ بٹائے گی"۔

تعلیماتِ اسلامی کے تحت والدین پر اولاد کے متعدد حقوق عائد ہوتے ہیں۔ مثلاً ۱ : زندگی کا حق ۲ : بُنیادی ضروریات کی فراہمی، یعنی کھانے پینے، رہائش اور علاج کا حق۔ ۳ : حسبِ مقدُور تعلیم و تربیت کا حق۔

اگر والدین یہ جُملہ حقُوق بحُسن وخُوبی ادا کرتے رہیں تو نہ صرف یہ کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی خُوشنودی حاصل ہوتی ہے۔ بلکہ ان کی اولاد ان کے بڑھاپے کا سہارا بنتی ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ اولاد کے حقوق کی ادائیگی پر اپنے آرام و آسائش کو مقدّم رکھتے ہیں، ان کی اولاد ان کی آخری عُمر میں انہیں بے سہارا چھوڑ دیتی ہے۔ والدین کا فرض ہے کہ جہاں اپنی اولاد کو روزی کمانے کے قابل بنانے کی تدبیر کرتے رہیں

وہاں ان میں فکرِ آخرت بھی پیدا کریں اور عملِ صالح کی تربیت دیں۔
اللہ تعالیٰ نے والدین کی ذمہ داری کو بڑے بلیغ انداز میں بیان فرمایا:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَ
أَهْلِيكُمْ نَارًا (سورۃ التحریم : ٦)

ترجمہ : اے ایمان والو! بچاؤ اپنی جان کو اور اپنے گھر
والوں کو آگ سے۔

بلاشبہ اگر والدین خدا اور رسول کے حکم کے مطابق اپنی اولاد کے حقوق بطریق احسن ادا کریں اور اسے نیکی کی راہ پر لگائیں، تو نہ صرف یہ کہ وہ دنیا میں ان کی راحت کا سامان بنے گی بلکہ آخرت میں بھی ان کی بخشش کا ذریعہ بنے گی۔

میاں بیوی کے باہمی حقوق

معاشرے کی بُنیادی اکائی گھر ہے، اور گھر کے سکون اور خوشحالی کا انحصار میاں بیوی کے خوشگوار تعلقات پر ہے۔ اس کی عمدگی محض دو افراد ہی کی نہیں بلکہ دو خاندانوں کی شادمانیوں کا سبب بنتی ہے۔ اگر ان کے تعلقات میں بگاڑ پیدا ہو جائے تو یہ صورتِ حال بہت سے رشتوں کو کمزور کر دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زوجین کے حقوق کا تعین فرماتے ہوئے ایک مقام پر ارشاد فرمایا ہے:۔

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۖ وَ
لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۗ (سورۃ البقرۃ : ٢٢٨)

ترجمہ: اور عورتوں کا بھی حق ہے۔ جیسا کہ مردوں کا ان پر حق ہے، دستور کے موافق اور مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے۔

لیکن یہ درجہ محض گھر کا اِنتظام ایک زیادہ باہمّت، حوصلہ مند اور قوی شخصیت کے سپُرد کرنے کے لیے ہے، عورتوں پر ظلم روا رکھنے کے لیے نہیں۔ اسلام وہ واحد مذہب ہے جس نے خواتین کا شرف بحال کیا اور مردوں کو ان پر حکومت کا اختیار دینے کی بجائے ان کی حفاظت کی ذمّہ داری سپُرد کی اور تلقین کی کہ بیویوں کے ساتھ اچھّا سلوک کیا جائے۔ نبیؐ کریمؐ نے بیویوں کے ساتھ حُسنِ سلوک کو خیر اور اچھائی کا معیار بنایا۔ ارشاد ہُوا:۔

خَیرُکُمْ خَیرُکُمْ لِاَھلِہٖ

ترجمہ: تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ اچھّا ہے۔

ایک بار ایک صحابیؓ نے نبی اکرمؐ سے دریافت کیا۔ "یارسول اللہؐ! بیوی کا اپنے شوہر پر کیا حق ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا۔ "جو خُود کھائے، اسے کھلائے۔ جیسا خود پہنے، ویسا اسے پہنائے۔ نہ اس کے مُنّہ پر تھپڑ مارے، نہ اسے بُرا بھلا کہے۔" آپؐ کو بیویوں کے حقُوق کا اتنا خیال تھا کہ خطبہ حجۃ الوداع میں ان سے حُسنِ سلوک کی تلقین فرمائی۔ دُوسری جانب اللہ تعالیٰ نے نیک بیویوں کی صفات بیان کرتے ہُوئے فرمایا:۔

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ (سُورۃ النّساء: ۳۴)

ترجمہ: پھر جو عورتیں نیک ہیں سو اطاعت گزار ہیں نگہبانی کرتی ہیں پیٹھ پیچھے۔

جہاں مرد کو منتظمِ اعلیٰ کی حیثیت سے بیوی بچوں کی کفالت اور حفاظت کی ذمہ داری سونپی گئی، وہاں عورتوں کو پابند کیا گیا کہ وہ مردوں کی وفادار اور اطاعت گزار بن کر رہیں۔ ایک مسلمان بیوی کے لیے شوہر کی جو حیثیت ہوتی ہے، اس کا اندازہ نبی کریمؐ کے اس ارشاد گرامی سے ہوتا ہے۔ "اگر میں خدا کے علاوہ کسی اور کو سجدے کا حکم دیتا تو بیوی سے کہتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔" ساتھ ہی شوہر کو نصیحت کی گئی ہے کہ اپنے اختیارات کا ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے بیوی پر سختی نہ کرے۔ بلکہ اگر اس میں کچھ خامیاں بھی پائی جاتی ہوں تو درگزر کرے اور اس کی خوبیوں کی قدر کرے۔ اس بارے میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا ○ (سورۃ النسآء : ۱۹)

ترجمہ: اور گزران کرو عورتوں کے ساتھ اچھی طرح پھر اگر وہ تم کو نہ بھاویں۔ شاید تم کو پسند نہ آوے ایک چیز اور اللہ نے رکھی ہو اس میں بہت خوبی۔

اس بات کی تصریح نبی اکرمؐ کی ایک حدیثِ مبارک سے ہوتی ہے

جس میں آپؐ نے فرمایا۔ "اپنی بیویوں میں کوئی برائی دیکھ کر ان سے نفرت نہ کرنے لگ جاؤ۔ اگر تم غور کرو گے تو تمہیں ان میں کوئی اچھائی بھی ضرور نظر آجائے گی۔

رشتہ داروں کے حقوق

والدین اور اولاد اور شریکِ حیات (بیوی) کے حقوق کے بعد، اسلام رشتہ داروں کے حقوق پر زور دیتا ہے۔ کیونکہ معاشرتی زندگی میں انسان کا واسطہ اہلِ خانہ کے بعد سب سے زیادہ انھی سے پڑتا ہے۔ اگر خاندان کے افراد ایک دوسرے کے حقوق اچھے طریقے سے ادا کرتے رہیں، تو پورے خاندان میں محبت اور اپنائیت کی فضا قائم ہوگی، اور اگر معاملہ اس کے برعکس ہو تو نفرت اور دوری پیدا ہو جائے گی، اور آئے دن کے جھگڑوں سے خاندان کا سکون برباد ہو کر رہ جائے گا۔ قرآن اور حدیث دونوں میں صلۂ رحمی یعنی رشتہ داروں سے حُسنِ سلوک کی بار بار تلقین کی گئی۔ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے :۔

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ (سورۃ الاسراء : ۲۶)

ترجمہ : رشتہ دار کو اس کا حق دو۔

نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا :۔

لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَاطِعٌ

ترجمہ : رشتہ داروں سے تعلق توڑنے والا جنّت میں داخل نہیں ہوگا۔

مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ اپنے ضرورت مند رشتہ داروں کی ضروریات کا خیال رکھیں، تاکہ انہیں غیروں کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے۔ تلقین کی گئی ہے کہ جو کچھ خدا کی راہ میں خرچ کریں، اس میں ترجیح اپنے رشتہ داروں کو دیں اور پھر ان کے ساتھ جو سلوک کریں اس پر انھیں طعنے دے کر اپنے اجر و ثواب برباد نہ کریں۔ انھیں احساسِ تنہائی اور احساسِ کمتری کا شکار نہ ہونے دیں۔ ان کی شادی، غم میں شریک ہوں۔ رشتے داروں کے ذریعے امداد کا ایک اہم فائدہ یہ ہے کہ اس سے انسان کی عزتِ نفس مجروح نہیں ہوتی اور کام نکل جاتا ہے جب کہ غیروں سے مدد طلب کرنے میں اپنی ہی نہیں، خاندان کی عزّت بھی گھٹتی ہے۔ اگر ہم میں سے ہر شخص خدا اور رسولؐ کی ہدایات کے مطابق اپنے رشتہ داروں کے حقوق کا خیال رکھے تو معاشرہ بہت سی خرابیوں سے محفوظ رہے گا۔

اساتذہ کے حقوق

اسلام نے جہاں مسلمانوں پر حصولِ علم کو فرض قرار دیا وہاں استاد کو بھی معزز ترین مقام عطا کیا تاکہ اس کی وجاہت سے علم کا وقار بڑھے اور علم سے انسانیت کا۔ استاد کا یہ اعزاز کیا کم ہے کہ اسے اس پیشے کی وجہ سے نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم سے ایک خصوصی نسبت حاصل ہے۔ جیساکہ ارشاد رسُول صلّی اللہ علیہ وسلّم ہے:۔

اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا

ترجمہ: مجھے تو معلّم ہی بنا کر بھیجا گیا ہے۔

استاد نئی نسل کی صحیح نشوونما کر کے اس کے فکر و عمل کی اِصلاح کرتے ہیں۔ نئی نسل انھی کے فراہم کردہ سانچوں میں ڈھلتی ہے۔ اُستاد کے اعزاز و احترام کے بارے میں حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا۔ "تیرے تین باپ ہیں۔ ایک وہ جو تجھے عدم سے وجُود میں لایا، دُوسرا وہ جس نے تجھے اپنی بیٹی دی، تیسرا وہ جس نے تجھے علم کی دولت سے مالا مال کیا۔

مُعلّم کی حیثیت علم کی بارش کی سی ہوتی ہے اور طلبہ کی زمین کی۔ جو زمین بارش کو جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، وہ بارش کے فیض سے سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے۔ یہ حوصلہ اور ظرف بھی، والدین کے علاوہ اُستاد کا ہوتا ہے کہ وہ اپنے شاگرد کو خُود سے آگے بڑھتے دیکھ کر حسد کرنے کی بجائے خُوش ہوتا ہے، کیونکہ حقیقت میں وہ اپنے طلبہ کی کامیابیوں کو اپنی ہی کامیابیاں سمجھتا ہے۔ مسلمانوں میں اُستاد کی احسان شناسی اور احترام کا اندازہ کُچھ اس رواج سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ شاگرد اُستاد کے نام کو اپنے نام کا حصّہ بنا لیتے تھے، اور اس طرح لائق شاگردوں کے ذریعے اُستاد کا نام زندہ رہتا تھا۔

ہمسایوں کے حقُوق

انسان کو روزمرّہ کی زندگی میں اپنے ہمسایوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ چنانچہ اسلام میں پڑوسیوں کے حقوق پر بڑا زور دیا گیا ہے اور تین قسم کے پڑوسیوں سے حُسنِ سلوک کی خصوصی تلقین فرمائی گئی ہے۔

اوّل: وہ پڑوسی جو رشتے دار بھی ہوں۔

دُوم: غیر رشتے دار پڑوسی (خواہ وہ غیر مسلم ہوں۔)

سُوم : جن سے عارضی طور پر تعلقات قائم ہو جائیں۔ مثلاً ہم پیشہ

ہم جماعت یا شریکِ سفر افراد

ہمسایوں کے حقوق کے بارے میں متعدد احادیث روایت کی گئی ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں :-

(الف) وہ شخص مومن نہیں جو اپنے ہمسائے کی بھوک سے بے نیاز ہو کر شکم سیر ہو۔

(ب) تم میں سے افضل شخص وہ ہے جو اپنے ہمسائے کے حق میں بہتر ہے۔

(ج) اگر پڑوسی کو مدد کی ضرورت پڑے، تو اس کی مدد کرو، قرض مانگے تو دو۔ محتاج ہو جائے تو اس کی مالی امداد کرو، بیمار پڑ جائے تو علاج کرواؤ، اور مر جائے تو جنازے کے ساتھ قبرستان جاؤ اور اُس کے بچّوں کی دیکھ بھال کرو۔ اگر اسے کوئی اعزاز حاصل ہو تو اسے مبارک باد دو۔ اگر مصیبت میں مُبتلا ہو جائے تو اس سے ہمدردی کرو۔ بغیر اجازت اپنی دیوار اتنی اونچی نہ کرو کہ اس کے لیے روشنی اور ہوا رُک جائے۔ کوئی میوہ یا سوغات وغیرہ لاؤ تو اُسے بھی بھیجو۔

(د) حضرت مجاھد رض فرماتے ہیں کہ رسُول کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم پڑوسیوں کے حقوق کے بارے میں اِتنی شدّت سے تاکید فرماتے تھے کہ ہم سوچنے لگتے کہ شاید میراث میں بھی پڑوسیوں کا حصّہ رکھ دیا جائے گا۔

(ر) ایک بار آپؐ کی محفل میں ایک عورت کا ذکر آیا کہ وہ بڑی

عبادت گزار اور پرہیز گار ہے۔ دن میں روزے رکھتی ہے اور رات کو تہجد ادا کرتی ہے، لیکن پڑوسیوں کو تنگ کرتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ "وہ دوزخی ہے" اور ایک دوسری عورت کے بارے میں عرض کیا گیا کہ وہ صرف فرائض (عبادات) ادا کرتی ہے لیکن ہمسایوں کے حقوق کا خیال رکھتی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا۔ "وہ جنتی ہے"

غیر مسلموں کے حقوق

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس بات کی صراحت فرمادی ہے کہ کافر اور مُشرک ہرگز ہرگز مسلمانوں کے دوست نہیں ہو سکتے۔ لیکن اس کے باوجود غیر مسلموں کے ساتھ حُسنِ سلوک سے پیش آنے کی ہدایت کی ہے۔ یہ صرف اسلام کی خوبی ہے کہ وہ غیر مسلموں کو مُسلمانوں کے سے شہری حقوق عطا کرتا ہے اور مُسلمانوں کو تلقین کرتا ہے کہ وہ ان سے شفقت آمیز برتاؤ کریں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:-

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۫ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ز (سورۃ المائدۃ: ۸)

ترجمہ: اور کسی قوم کی دشمنی کے باعث انصاف کو ہرگز نہ چھوڑو۔ عدل کرو۔ یہی بات زیادہ نزدیک ہے تقویٰ سے۔

اسلام چاہتا ہے کہ اس کے پیروکار غیر مُسلموں سے ویسا ہی برتاؤ کریں جیسا ایک ڈاکٹر مریض سے کرتا ہے۔ اسی حُسنِ سلوک سے مسلمانوں نے ہمیشہ غیر مُسلم اقوام کے دل جیت لیے۔

معاشرتی ذمّہ داریاں

اسلام انسانی مُعاشرے کو خوش حال دیکھنا چاہتا ہے۔ اِس لیے اس نے اخلاقِ حسنہ کو بڑی اہمیت دی ہے اور مُسلمانوں کے لیے اخلاقی قدروں کی پاسداری کو مذہبی فریضہ قرار دیا۔ اس سلسلے میں چند محاسنِ اخلاق کا ذکر کیا جاتا ہے۔

دیانت داری

معاشی اور معاشرتی تعلقات کی استواری کے لیے دیانت ایک بُنیادی شرط ہے، جس مُعاشرے سے دیانت داری ختم ہو جائے وہاں کاروباری معاملات سے لے کر گھریلو تعلقات تک ہر جگہ ناقابلِ اصلاح بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک دُوسرے پر سے اعتماد اُٹھ جاتا ہے۔ اسلام اپنے نام لیواؤں کو ان تمام نقصانات سے بچانے کے لیے دیانتداری کی تلقین کرتا ہے ارشادِ ربانی ہے :۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا (سورۃ النّساء : ۵۸)

ترجمہ : بے شک اللہ تم کو فرماتا ہے کہ پہنچا دو امانتیں امانت والوں کو ۔

نیز جہاں دُنیا و آخرت کی فلاح حاصل کرنے والوں کی دیگر صفات بتائی گئی ہیں، وہاں یہ بھی فرمایا گیا ہے :۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ (سورۃ المومنون: ۸)

ترجمہ: اور جو اپنی امانتوں سے اور اپنے اقرار سے خبردار ہیں۔

نبی اکرمؐ کے بارے میں کون نہیں جانتا کہ آپؐ منصبِ نبوّت پر سرفراز ہونے سے قبل بھی عرب کے بد دیانت معاشرے میں "الامینؐ" یعنی دیانت دار کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔ آپؐ کے احساسِ دیانت کا یہ عالَم تھا کہ مدینے ہجرت کرتے وقت بھی ان لوگوں کی امانتوں کی ادائیگی کا اہتمام فرمایا جو آپؐ کے قتل کے درپے تھے۔ اِسلام نے دیانت کے مفہوم کو محض تجارتی کاروبار تک محدُود نہیں رکھا، بلکہ وسعت دے کر جُملہ حقوق العباد کی ادائیگی کو دیانت کے دائرے میں شامل کر دیا۔ نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا۔ "محفل میں کی جانے والی باتیں بھی امانت ہیں۔" یعنی ایک جگہ کوئی بات سُن کر دوسری جگہ جا سنانا بھی بد دیانتی میں داخل ہے۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر مسلمانوں کو تلقین کی گئی کہ وہ اپنی تمام جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کو اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہُوئی امانتیں سمجھیں، اور ان سب کو اس احساس کے ساتھ استعمال کریں کہ ایک روز اللہ تعالیٰ کو ان کا حساب دینا ہے۔ دیانت کی اس تعریف کے پیشِ نظر نا مُمکن ہے کہ کوئی شخص مُسلمان بھی ہو اور بد دیانت بھی۔ اسی لیے حضُور اکرمؐ نے فرمایا:۔

"جس میں دیانت نہیں اس میں ایمان نہیں۔"

ایفائے عہد

انسانوں کے باہمی تعلقات میں ایفائے عہد یعنی وعدہ پُورا کرنے کو جو اہمیّت حاصل ہے، وہ مُحتاجِ بیان نہیں۔ ہمارے اکثر معاملات کی بنیاد وعدوں پر ہوتی ہے۔ وہ پُورے ہوتے رہیں تو معاملات ٹھیک رہتے ہیں۔ اگر ان کی خلاف ورزی شروع ہو جائے تو سارے مُعاملات بگڑ جاتے ہیں۔ اسی بگاڑ سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کے لیے اسلام ایفائے عہد کی تلقین کرتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :-

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا ۝ (سورۃ الاسراء: ۳۴)

ترجمہ : اور پورا کرو عہد کو بے شک عہد کی پوچھ ہوگی۔

اِنسان کے تمام وعدوں میں اہم ترین عہد وہ ہے، جو اُس نے یومِ ازل سے بندگی کے معاملے میں اپنے خالق سے کیا ہے۔ قرآنِ عظیم نے اس کی یاد دہانی اس انداز سے کرائی ہے :-

وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ۚ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ (سورۃ الانعام : ۱۵۲)

ترجمہ : اور اللہ کا عہد پُورا کرو تم کو یہ حکم کر دیا ہے تاکہ تم نصیحت پکڑو۔

ایک اور مقام پر باہمی معاہدوں اور اجتماعی رشتوں کی پاسداری کا لحاظ رکھنے کی ہدایت اس طرح فرمائی گئی۔

اَلَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ۝

وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ (سورۃ الرّعد : ۲۰، ۲۱)

ترجمہ : وہ لوگ جو پورا کرتے ہیں اللہ کے عہد کو اور نہیں توڑتے اس عہد کو اور وہ لوگ جو ملاتے ہیں جن کو اللہ نے فرمایا ملانا۔

نبی کریمؐ نے سخت حالات میں بھی عہد کی پابندی فرمائی۔ مثلاً جب صُلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت ابو جندلؓ زنجیروں میں جکڑے ہُوئے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہُوئے اور انہوں نے اپنے جسم کے داغ دکھائے کہ اہلِ مکّہ نے انہیں مُسلمان ہو جانے پر کتنی اذیّت دی ہے اور درخواست کی کہ انہیں مدینہ ساتھ لے جایا جائے تو آپؐ نے اس شفقت کے باوصف، جو آپؐ کو مُسلمانوں سے تھی، انہیں اپنے ہمراہ مدینے لے جانے سے محض اس لیے انکار کر دیا کہ قریش سے معاہدہ ہو چکا تھا کہ مکّہ سے بھاگ کر آنے والے مسلمانوں کو مدینے سے لَوٹا دیا جائے گا۔ حضرت ابو جندلؓ کی دردناک حالت تمام صحابہ کرامؓ کے لیے بے قراری کا باعث تھی، لیکن صلح نامہ حدیبیہ کی پاسداری کے پیش نظر سب نے صبر و تحمّل سے کام لیا۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرمؐ اپنے خطبوں میں اکثر یہ بات فرماتے تھے۔

لَا دِيْنَ لِمَنْ لَّا عَهْدَ لَهٗ

ترجمہ : جسے وعدے کا پاس نہیں اس میں دین نہیں۔

ہمارے لین دین کے جُملہ معاملات اور باہمی حقوق ایفائے عہد ہی

کے ذیل میں آتے ہیں۔ اس لیے دین داری کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ان سب کی پاسداری کریں۔

سچّائی

سچّائی ایک ایسی عالمگیر حقیقت ہے جسے تسلیم کیے بغیر انسان سُکھ چین کا سانس نہیں لے سکتا۔ نبیّ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس بات کو نہایت جامعیت کے ساتھ یوں ارشاد فرمایا :۔

اَلصِّدْقُ یُنْجِیْ وَالْکِذْبُ یُھْلِکُ

ترجمہ: سچائی انسان کو ہر آفت سے محفوظ رکھتی ہے اور جھوٹ اسے ہلاک کر ڈالتا ہے۔

قرآن کریم میں باری تعالیٰ نے اپنے صادق القول ہونے کا ذکر فرمایا مثلاً

وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ حَدِیْثًا (سُورۃ النّساء : ۸۷)

ترجمہ : اور اللہ سے سچّی کِس کی بات ہے۔

اسی طرح قرآن حکیم میں انبیاءؑ کی اس صفت کا بطورِ خاص ذکر کیا گیا ہے کہ وہ راست گفتار تھے۔ سچائی کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہے۔ تمام انبیاءؑ نے وہیں سے سچائی حاصل کی اور دُنیا میں پھیلائی۔ اس سچّائی سے انکار کرنے والا زندگی کے ہر مُعاملے میں جھُوٹ اور باطل کی پیروی کرتا ہے، اور ہلاک ہو کر رہتا ہے۔ اردُو میں ہم سچ کا لفظ محض گفتگو کے تعلّق سے استعمال کرتے ہیں، لیکن قرآن مجید میں اس کے مفہوم میں قول کے ساتھ عمل اور خیال تک کی سچائی شامل ہے۔ یعنی صادق وہ ہے جو

نہ صرف زبان ہی سے سچ بولے بلکہ اس کے فکر و عمل میں بھی سچائی رچی بسی ہو۔

عدل و انصاف

عدل و انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کا جائز حق بہ آسانی مل جائے۔ نظامِ عدل کی موجودگی میں معاشرے کے امور بخیر و خوبی سرانجام پاتے ہیں اور بے انصافی کی وجہ سے معاشرے کا ہر شعبہ مفلوج ہو کر رہ جاتا ہے۔ بعثتِ نبویؐ سے قبل دنیا عدل و انصاف کے تصور سے خالی ہو چکی تھی۔ طاقتور ظلم و ستم کو اپنا حق سمجھنے لگے تھے اور کمزور اپنی مظلومیت کو مقدر سمجھ کر برداشت کرنے پر مجبور تھے۔ دین اسلام کے طفیل ظلم و ستم کا یہ کاروبار بند ہُوا اور دُنیا عدل و انصاف کے اس اعلیٰ معیار سے آشنا ہُوئی جس نے رنگ و نسل اور قوم و وطن کے امتیازات کو مٹا کر رکھ دیا۔ ناانصافی کی بنا پر انسانوں کے مختلف طبقوں اور گروہوں کے درمیان نفرت کی جو دیوار کھڑی ہو گئی تھی، اِسلام نے اسے گرا کر انسان کو انسان کے شانہ بشانہ لا کھڑا کیا۔ اس طرح لوگوں کے درمیان اُنس و محبت کا وہ رشتہ استوار ہُوا جو انسانیت کے لیے سرمایۂ افتخار ہے۔ اسلام وہ دین ہے جس نے عدل و انصاف کے معاملے میں بلا امتیاز تمام نسلِ انسانی کے درمیان مساوات قائم کرنے کا حکم دیا۔ قرآن حکیم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے :-

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ (سورة المائدة : ٨)

ترجمہ: اے ایمان والو! کھڑے ہوجایا کرو اللہ کے واسطے گواہی دینے کو انصاف کی اور کسی قوم کی دشمنی کے باعث انصاف کو ہرگز نہ چھوڑو۔ عدل کرو۔ یہی بات زیادہ نزدیک ہے تقویٰ سے۔

رنگ و نسل کی طرح اسلام کے تصوّرِ عدل میں کِسی کے اعلیٰ منصب اور مرتبے کو کوئی اہمیت نہیں۔ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے وہ ارشادات آبِ زر سے لِکھے جانے کے قابل ہیں، جو آپؐ نے قبیلہ بنی مخزوم کی فاطمہ نامی خاتون کی چوری سے متعلق سزا کی معافی کی سفارش سُن کر ارشاد فرمائے۔ آپؐ نے فرمایا۔ "تم سے پہلے قومیں اسی سبب سے برباد ہُوئیں کہ ان کے چھوٹوں کو سزا دی جاتی تھی اور بڑوں کو معاف کر دیا جاتا تھا۔ خدا کی قسم! اگر فاطمہؓ بنت محمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔

اِسلامی حکومت کی یہ خصوصیّت رہی ہے کہ اس نے اپنے باشندوں کو ہمیشہ بے لَوث انصاف فراہم کیا ہے اور حقیقت میں اِسلامی حکومت کا اصل مقصد ہی نظامِ عدل کا قیام ہے۔ اسی لیے نبی اکرمؐ نے سُلطانِ عادل کو خدا کا سایہ قرار دیا۔

اِحترامِ قانُون

جس طرح قدرت کا نظام چند فطری قوانین کا پابند ہے، اِسی طرح مُعاشرے کا قیام و دوام، معاشرتی، اخلاقی اور دینی احکام و قوانین پر موقوف ہے۔ یُوں تو دُنیا کا کم عقل سے کم عقل انسان بھی قانون کی ضرورت، اس کی پابندی اور اہمیّت کا اعتراف کرے گا، لیکن کم لوگ ایسے ہیں جو عملاً قانون کے تقاضے پورے کرتے ہوں۔ عصرِ حاضر میں دو افراد کے باہمی معاملات سے

سے کر بین الاقوامی تعلقات تک لوگ ضابطے اور قانون کی پابندی سے گریزاں ہیں، اور لاقانونیت کے اس رجحان نے دنیا کا امن وسکون غارت کر دیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ انسان قانون کی افادیت کا قائل ہونے کے باوجود اس کی خلاف ورزی کیوں کرتا ہے؟ اس کی دو اہم وجوہ ہیں:-

۱: ایک خود غرضی اور مفاد پرستی۔

۲: دوسرے اپنے آپ کو قانون سے بالاتر سمجھنا۔

اِسلام ان دونوں وجوہ کا خوبی سے تدارک کر کے مسلمانوں کو قانُون کا پابند بناتا ہے۔ ایک طرف وہ انہیں خدا پرستی اور ایثار و سخاوت کا درس دیتا ہے دوسری طرف ان میں آخرت کی جواب دہی کا احساس وشعور پیدا کرتا ہے۔ اسلام انہیں احساس دلاتا ہے کہ وہ اپنے اثرو رسُوخ یا دھوکے فریب سے دنیا میں قانون کی خلاف ورزی کی سزا سے بچ بھی گئے تو آخرت میں انہیں خدا کی گرفت سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ آخرت میں جواب دہی کا یہی احساس اسلامی معاشرے کے گناہ میں ملوّث ہو جانے والے افراد کو ازخود عدالت میں جانے پر مجبُور کرتا ہے اور وہ اصرار کرتے ہیں کہ انہیں دُنیا ہی میں سزا دے کر پاک کر دیا جائے تاکہ وہ آخرت کی سزا سے بچ جائیں۔

لوگوں کے دلوں میں قانون کے احترام کا سچّا جذبہ پیدا کرنے کے لیے ضرُوری ہے کہ خود حُکمران طبقہ بھی قانون کی پاسبانی کرے اور اپنے اثرو رسُوخ کو قانون کی زد سے بچنے کا ذریعہ نہ بنائے۔ آج دنیا میں قانُون کے سامنے سب کے برابر ہونے کا چرچا تو بہُت ہے۔ لیکن دنیا کا شاید ہی کوئی دستور یا آئین ایسا ہو، جس میں حکمران طبقے کو مخصوص

مراعات مُہیا نہ کی گئی ہوں، اور قانون میں آقا و غلام اور شاہ و گدا کا کوئی امتیاز نہ ہو۔ اسلامی تاریخ کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علیؓ کی زرہ گم ہوگئی اور ایک یہودی سے مِلی۔ خود خلیفہ وقت ہونے کے باوصف آپ اسے قاضی کی عدالت میں لے گئے اور جب اس نے آپ کے بیٹے اور غلام دونوں کی گواہی ان سے قریبی تعلق کی بنا پر قبول کرنے سے انکار کر دیا تو آپ اپنے دعویٰ سے دستبردار ہوگئے۔ احترامِ قانون کی اس مثال نے یہودی کو اتنا متاثر کیا کہ وہ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوگیا۔

کسبِ حلال

کسبِ حلال کے بارے میں قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

يَاأَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا

(سورۃ المومنون : ۵۱)

ترجمہ: اے رسُولو! کھاؤ ستھری چیزیں اور کام کرو بھلا۔

اِسی طرح تمام انسانوں کو تلقین فرمائی گئی۔

يَاأَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا (سورۃ البقرۃ: ۱۶۸)

ترجمہ: اے لوگو! کھاؤ زمین کی چیزوں میں سے حلال پاکیزہ۔

مزید برآں مسلمانوں کو خصوصی تاکید کی گئی:۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا كُلُوا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ (سورۃ البقرۃ: ۱۷۲)

ترجمہ: اے ایمان والو! کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو روزی دی ہم نے تم کو۔

اسلام میں عبادات اور معاملات کے ضمن میں کسبِ حلال کو بے حد اہمیت حاصل ہے۔ اس لیے عبادات کی مقبولیت کے لیے کسبِ حلال کو لازمی شرط قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :۔

وَلَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (سورۃ البقرۃ: ۱۸۸)

ترجمہ : اور نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کا آپس میں ناحق۔

جس معاشرے میں ناجائز ذرائع آمدنی یعنی ناانصافی، بددیانتی رشوت ستانی، سود خوری، چوری، ڈاکہ زنی، ذخیرہ اندوزی، فریب دہی اور سٹّے بازی کا رواج عام ہو جائے تو اس معاشرے کی کشتی تباہی کے گرداب میں پھنس کر رہ جاتی ہے اور بربادی اس معاشرے کا مقدر بن جاتی ہے۔ اسلام ہر معاملے میں کسبِ معاش کے ان تمام غلط طریقوں سے بچنے کی تلقین کرتا ہے اور ناجائز ذرائع کے اختیار کرنے والوں کو جہنم کی خبر دیتا ہے۔ آپؐ کا ارشاد مبارک ہے۔ "حرام رزق پر پلنے والے جسم کو جہنم ہی کا ایندھن بننا چاہیے۔" جس شخص کو خدا تعالیٰ اور یومِ آخرت پر یقین ہوگا وہ کبھی جائز وسائل کو چھوڑ کر ناجائز ذرائع کا رُخ نہیں کرے گا، خواہ ان میں کتنی ہی دلکشی کیوں نہ ہو۔ البتہ جو شخص اس شیطانی وسوسے میں مبتلا ہو کہ میں ناجائز ذرائع سے اپنے مقدّر سے زیادہ کما سکتا ہوں، وُہی حرام طریقوں کا سہارا لے گا۔ شیطان کے اس حربے کو ناکام بنانے کا سہل طریقہ یہ ہے کہ اعلیٰ معیار زندگی کا ڈھونگ رچانے کی بجائے سادگی، کفایت شعاری، میانہ روی اور قناعت پسندی کے اصُولوں پر کاربند رہا جائے۔

ایثار

دنیا پرستی اگر انسان کو خود غرضی اور مفاد پرستی سکھاتی ہے تو خدا پرستی اس میں جذبۂ ایثار پیدا کرتی ہے۔ وہ خُود تکلیف اُٹھا کر خلقِ خدا کو راحت و آرام پہنچاتا ہے۔ اس کا عمل خدا کی بارگاہ میں شرفِ قبولیت پائے گا اور اُخروی نعمتوں کے حصول کا سبب بنے گا۔

دیگر محاسنِ اخلاق کی طرح نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم ایثار و سخاوت کا بہترین نمُونہ تھے اور سربراہِ مملکت ہوتے ہوئے بھی انتہائی غربت و عُسرت کی زندگی گزارتے تھے۔ خانۂ مُبارک میں ہفتوں چولہا نہیں جلتا تھا۔ لیکن آپؐ کے گھر سے کوئی سائل محرُوم نہیں اُٹھا۔ اپنے پاس کچھ موجود نہ ہوتا تو قرض لے کر حاجت مند کی حاجت پوری کرتے ایک بار آپؐ نے جانور ذبح فرمایا، اور گوشت تقسیم کی غرض سے گھر بھیج دیا۔ کچھ دیر بعد گھر میں آ کر دریافت فرمایا۔ کتنا تقسیم ہو گیا ہے اور کتنا بچا۔ عرض کیا گیا کہ عمدہ قسم کا گوشت تقسیم ہو گیا ہے اور خراب قسم کا گوشت باقی رہ گیا ہے۔ حضور اکرمؐ نے ارشاد فرمایا۔ "اور جو تقسیم ہو گیا ہے، وہ رہ گیا ہے اور جو باقی بچا ہے، حقیقت میں وہ چلا گیا ہے۔"

صحابہ رضؓ بھی جذبۂ ایثار سے سرشار تھے اور اپنی ضرورت پر دوسروں کی حاجت کو ترجیح دیتے تھے۔ مشہور واقعہ ہے کہ رومیوں کے مقابلے میں جانے والی فوج کے ساز و سامان کے لیے مُسلمانوں سے مالی اعانت طلب کی گئی تو حضرت ابوبکر صدیق رضؓ گھر کا سارا سامان لے آئے۔ ایک دفعہ حضرت عثمان رضؓ نے قحط کے زمانے میں باہر سے آنے والا غلہ دوگنے، چوگنے منافع کی پیش کش کرتے ہُوئے خرید ا،

اور بلا معاوضہ تقسیم کر دیا۔

صحابہٗ کرام رضہ کے ایثار کے سلسلے میں ایک واقعہ بڑا اثر انگیز ہے۔ ایک بار کوئی بھوکا پیاسا شخص حضور پُر نور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے پاس حاضر ہُوا۔ رسُولِ کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے دولت کدے پر پانی کے سوا کچھ نہ تھا۔ حسبِ دستور ایک انصاری صحابی رضہ آپؐ کے مہمان کو اپنے ہمراہ لے گئے۔ گھر پہنچ کر بیوی سے معلوم ہُوا کہ کھانا صرف بچّوں کے لیے کافی ہے۔ انہوں نے کہا کہ بچوں کو بہلا کر فاقے کی حالت میں سُلا دو اور کھانا شرُوع کرتے وقت کسی بہانے چراغ بجھا دو تاکہ مہمان کو یہ اندازہ نہ ہو سکے کہ ہم کھانے میں شریک نہیں۔ ایسا ہی کیا گیا۔ مہمان نے شکم سیر ہو کر کھانا کھایا اور انصاری کا یہ پُورا گھرانا بھوکا سویا۔ صبح جب یہ صحابی رضہ حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہُوئے تو حضورؐ نے ارشاد فرمایا۔ اللہ جلّ شانہٗ تمہارے رات کے حُسنِ سلوک سے بہُت خوش ہُوا۔ ایسے ہی ایثار پیشہ لوگوں کی تعریف و توصیف کرتے ہُوئے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:۔

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (سورۃ الحشر: ۹)

ترجمہ: اور مقدم رکھتے ہیں ان کو اپنی جان سے اور اگرچہ ہو اپنے اوپر فاقہ

ہجرت کے موقع پر انصارِ مدینہ رضہ نے مہاجرین مکّہ رضہ کے ساتھ حُسنِ سلوک کے سلسلے میں جس ایثار و قربانی کا ثبوت دیا اس کی مثال تاریخِ عالم میں ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔

رذائلِ اخلاق

جس طرح اخلاق حسنہ کی ایک طویل فہرست ہے، جن کو اپنا کر آدمی دُنیا اور آخرت میں سُرخرُو ہو سکتا ہے اسی طرح کچھ ایسے اخلاقِ رذیلہ ہیں جن کو اختیار کر کے انسان حیوانی درجے میں جا گرتا ہے اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم ہو جاتا ہے۔ مسلمانوں کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ وہ اخلاق فاضلہ سے آراستہ ہوں اور اخلاق رذیلہ سے بچیں، جو انسان کی شخصیت کو داغ دار کر دیتے ہیں اور اسے ہر قسم کی نیکی اور بھلائی سے محرُوم کر دیتے ہیں۔

جھُوٹ

جھُوٹ نہ صرف یہ کہ بجائے خود ایک بُرائی ہے، بلکہ دیگر بہت سی اخلاقی بُرائیوں کا سبب بھی بنتا ہے۔ اسلام میں جھُوٹ بولنے کی سختی سے مذمّت کی گئی ہے۔ جھوٹ بولنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی لعنت کا مستحق ٹھرایا گیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِىْ مَنْ هُوَ كَاذِبٌ كَفَّارٌ ۝ (سورۃ الزّمر: ۳)

ترجمہ: البتہ اللہ راہ نہیں دیتا اس کو جو جھوٹا حق نہ ماننے والا ہو۔

نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم سے کسی شخص نے دریافت کیا۔ "یا رسُول اللہؐ! جنّت میں لے جانے والا کون سا عمل ہے؟" آپؐ نے ارشاد فرمایا۔ "سچ بولنا۔ جب بندہ سچ بولتا ہے تو نیکی کا کام کرتا ہے۔ اس سے اُس کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور ایمان میں یہ اضافہ جنّت میں داخلے کا سبب بنتا ہے۔" اس شخص نے دریافت کیا۔ "یا رسُول اللہؐ! دوزخ میں لے جانے والا کام کیا ہے؟" فرمایا۔ "جب بندہ جھوٹ بولے گا تو گناہ کے

کام کرے گا۔ جب گناہ کے کام کرے گا تو کفر کرتا چلا جائے گا اور یہ کفر اسے جہنم میں لے جائے گا۔" جھوٹ کا تعلق محض زبان سے نہیں بلکہ بہت سے دُوسرے ناپسندیدہ اعمال بھی جھوٹ کی تعریف میں آتے ہیں۔ مثلاً غلط طریقے سے کسی کا مال ہتھیانا، کم تولنا، غرور کرنا، منافقت سے کام لینا وغیرہ نبیِ اکرمؐ نے نمُود و نمائش کو بھی جھوٹ کی ایک قسم قرار دیا۔ جھوٹ کے نتیجے میں باہمی اعتبار اور اعتماد ختم ہو جاتا ہے اور معاشرتی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ جھوٹ کی ہر قسم سے پرہیز کریں۔

غیبت اخلاقی بیماریوں میں غیبت جس قدر بُری بیماری ہے بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں اسی قدر عام ہے۔ بہت ہی کم لوگ ہوں گے جو اس بیماری سے محفوظ ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس گناہ سے بچنے کی تلقین کرتے ہوئے فرماتا ہے:۔

وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۭ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ۭ (سُورۃ الحجرات : ۱۲)

ترجمہ: اور بُرا نہ کہو پیٹھ پیچھے ایک دُوسرے کو، بھلا خوش لگتا ہے۔ تم میں کسی کو کہ کھائے گوشت اپنے بھائی کا جو مردہ ہو تو گِھن آتا ہے تم کو اس سے۔

غیبت کے لیے مُردہ بھائی کا گوشت کھانے کی تمثیل انتہائی بلیغ ہے۔ کیونکہ جس شخص کی غیبت کی جاتی ہے، وہ اپنی مدافعت نہیں کرسکتا۔ اس طرح غیبت سے باہمی نفرت کو ہوا ملتی ہے اور دشمنی کے جذبات بھڑکتے ہیں۔ غیبت کے مرض میں مبتلا شخص خُود کو عمُوماً عیبوں سے پاک تصوّر

کرنے لگتا ہے اور جس کی غیبت کی جائے وہ اپنے عیب تشہیر ہو جانے کے باعث اور ڈھیٹ ہو جاتا ہے۔ غرض غیبت ہر لحاظ سے معاشرتی سکون کو برباد کرتی ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کے واقعات بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ میں نے ایک گروہ کو دیکھا کہ ان کے ناخن تانبے کے تھے، اور وہ لوگ اس سے اپنے چہروں اور سینوں کو نوچ رہے تھے۔ میں نے جبریل علیہ السلام سے دریافت کیا۔ یہ کون لوگ ہیں؟ فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے ہیں اور ان کی عزت و آبرو بگاڑتے ہیں (یعنی غیبت کرتے ہیں)

شریعت اسلامی میں غیبت صرف دو صورتوں میں جائز قرار دی گئی ہے۔ ایک مظلوم کی ظالم کے خلاف فریاد کی شکل میں اور دوسرے لوگوں کو کسی فریب کار کی فریب کاری سے آگاہ کرنے کے لیے۔ بعض علما نے نقل اُتارنے اور تحقیر آمیز اشارات کرنے کو بھی غیبت میں شمار کیا ہے۔

غیبت و اتہام کا فرق

غیبت اور اتہام میں فرق ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ غیبت سے مُراد کسی شخص کی عدم موجودگی میں اس کی بُرائی بیان کرنا ہے، جو اس میں موجود ہے، جب کہ تہمت لگانے سے مُراد یہ ہے کہ کسی شخص کا ایسا عیب بیان کیا جائے جو اس میں موجود نہیں ہے اور اس کے دامنِ عفت کو بلاوجہ داغ دار بنایا جائے۔

منافقت

علمائے اسلام نے منافق کی دو اقسام بیان کی ہیں۔ ایک وہ منافق جو دل سے اسلام کی صداقت و حقانیت کا قائل نہیں،

لیکن کسی مصلحت یا شرارت کی بنا پر اسلام کا لبادہ اوڑھ کر مسلمانوں اور اسلام دونوں کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ اسے اعتقادی منافق کہتے ہیں۔ دوسرا وہ منافق ہے جو اگرچہ خلوصِ نیّت سے اسلام قبول کرتا ہے لیکن بعض بشری کمزوریوں کی وجہ سے اِسلام کے عملی احکام پر چلنے میں تساہل یا کوتاہی کرتا ہے۔ اسے عملی منافق کہتے ہیں۔ پہلی قسم کا منافق کافروں سے بد تر ہے، جب کہ دوسری قسم کا منافق صاحبِ ایمان ضرور ہے لیکن اس کی تعلیم و تربیت ابھی ناقص ہے جو کسی معلّم و مُربّی کے فیضانِ نظر یا صحبت نشینی سے اسے حاصل ہو سکتی ہے۔

مُسلمانوں کے خلاف منافقوں کی سب سے خطرناک چال یہ ہوتی ہے کہ وہ دین داری کے پردے میں مسلمانوں کو باہم لڑا دیں۔ اسی مقصد کے لیے انہوں نے مدینے میں مسجد نبویؐ کے مقابل مسجدِ ضرار تعمیر کی تھی لیکن اللہ تعالیٰ کے حکم سے نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس مسجد کو مسمار کرا کے ان کی سازش کو ناکام بنا دیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۚ وَمَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ ۚ (سورۃ التحریم : ۹)

ترجمہ: اے نبی! لڑائی کر منکروں سے اور دغا بازوں سے اور سختی کر ان پر اور ان کا گھر دوزخ ہے۔

ایک مرتبہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے منافق کی پہچان بتاتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ منافق کی تین نشانیاں ہیں۔

: جب بولے تو جھوٹ بولے۔

۲ : جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے۔

۳ : جب کوئی امانت اس کے سپرد کی جائے تو اس میں خیانت کرے۔

ان نشانیوں کے ہوتے ہوئے چاہے وہ نماز اور روزے کا پابند ہو وہ منافق ہی ہے۔ قرآن مجید میں ان منافقوں کے انجام کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ دوزخ کے سب سے نچلے اور تکلیف دہ حصے میں رکھے جائیں گے۔

تکبُّر

تکبر کے معنی خود کو بڑا اور برتر ظاہر کرنے کے ہیں۔ اردو میں اس کے لیے لفظ بڑائی استعمال کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مخلوقات میں سب سے پہلے شیطان نے تکبر کیا اور کہا کہ میں آدمؑ سے افضل ہوں۔ اس لیے ان کو سجدہ نہیں کروں گا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا تھا:-

فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُونُ لَكَ أَنْ تَتَكَبَّرَ فِيهَا فَاخْرُجْ إِنَّكَ مِنَ الصَّاغِرِينَ ○ (سورۃ الاعراف : ۱۳)

ترجمہ : تو اُتر یہاں سے تو اس لائق نہیں کہ تکبر کرے یہاں۔ پس باہر نکل تو ذلیل ہے۔

وہ دن اور آج کا دن، غرور کا سر ہمیشہ نیچا ہوتا چلا آیا ہے۔ اور فرمانِ خداوندی کے مطابق، آخرت میں بھی متکبر انسانوں کا ٹھکانا جہنم ہوگا:-

أَلَيْسَ فِي جَهَنَّمَ مَثْوًى لِلْمُتَكَبِّرِينَ ○ (سورۃ الزمر : ۶۰)

ترجمہ : کیا نہیں دوزخ میں ٹھکانہ غرور کرنے والوں کا۔

تکبر کی مذمت فرماتے ہوئے نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا۔" جس کے دل میں رائی برابر بھی غرور اور تکبر ہوگا وہ انسان جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

مغرور و متکبر انسان دوسروں کو حقیر سمجھ کر ظلم و زیادتی کرتا ہے اور گناہوں پر بے باک ہو جاتا ہے۔ اور یہ خیال کرتا ہے کہ مجھے میرے گناہوں کی سزا کون دے سکتا ہے۔ اسی لیے وہ مروت، اخوت، ایثار اور اس قسم کی بہت سی دوسری بھلائیوں سے محروم ہو جاتا ہے۔

حسد

انسان دوستی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے کسی بھائی کو اچھی حالت میں دیکھیں تو خوش ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی نعمتوں سے نوازا ہے۔ لیکن حسد وہ بری خصلت ہے جو کسی کو خوش حال اور پُرسکون دیکھ کر انسان کو بے چین کر دیتی ہے، اور وہ اپنے بھائی کی خوشحالی دیکھ کر خوش ہونے کی بجائے دل ہی دل میں جلتا اور کڑھتا ہے۔ ایسا کرنے سے وہ دوسروں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، خود اپنے لیے پریشانی مول لے لیتا ہے۔ یوں تو حسد ایک اخلاقی بیماری ہے لیکن اس کے نتیجے میں انسان کئی دوسری اخلاقی بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ مثلاً جب وہ دوسروں کو بہتر حالت میں دیکھنے کا روادار نہیں ہوتا تو اپنے بہت سے عزیزوں سے ترکِ تعلق کر لیتا ہے جو ایک ناپسندیدہ بات ہے۔ اِسی طرح جس شخص کی طبیعت میں حسد پیدا ہو جائے، وہ کبھی قانع نہیں ہو سکتا۔ وہ ہمیشہ اپنے سے برتر کو دیکھ کر اپنی حالتِ زار پر کفِ افسوس ملتا رہتا ہے۔ اس کی وہ صلاحیتیں جو حالت بہتر بنانے پر صرف ہو سکتی ہیں، ہمیشہ دوسروں کی حالت کو بگاڑنے ہی کی فکر میں ضائع ہوتی ہیں۔

حاسد اپنی بھڑکائی ہوئی آگ میں خود ہی جلتا رہتا ہے۔ گو اسلام اپنے پیروکاروں کو محبت اور احسان کی تلقین کرتا ہے لیکن حاسد کے دل میں سوائے نفرت اور جلن کے کوئی شریفانہ جذبہ جگہ نہیں پا سکتا۔ اجتماعی فلاح کے معانی یہ ہیں کہ معاشرے کے جملہ افراد معزز اور خوشحال ہوں، لیکن حاسد، لوگوں کی نیک نامی اور خوشحالی کو ذلت وخواری میں بدلتے دیکھنا چاہتا ہے۔ پس ایک نہ ایک دن وہ معاشرے کی نظروں میں ذلیل ہو کر رہتا ہے۔ مسلمانوں کو ان تمام نقصانات سے بچانے کے لیے حضور نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے حسد سے بچنے کی تلقین فرمائی۔ ارشاد فرمایا :-

إِيَّاكُمْ وَالْحَسَدَ فَإِنَّ الْحَسَدَ يَأْكُلُ

الْحَسَنَاتِ كَمَا تَأْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ

ترجمہ : دیکھو! حسد سے بچو۔ کیونکہ حسد نیکیوں کو اس

طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ خشک لکڑی کو۔

اگر انسان حسد جیسے اخلاقِ رذیلہ سے بچنا چاہے تو اسے بزرگانِ دین کی سادگی وقناعت کی تاریخی مثالوں سے نصیحت حاصل کرنی چاہیے۔ مزید برآں وہ دولت و اقتدار سے پیدا ہونے والی برائیوں اور مفاسد پر نظر رکھے۔

سوالات

۱ : ارکانِ اسلام سے کیا مُراد ہے؟ فرد کی تعمیر سیرت اور معاشرہ کی تشکیل میں نماز کیا کردار ادا کرتی ہے؟

۲ : روزے کے مقاصد بیان کریں اور عملی زندگی پر اس کے اثرات تفصیل سے لکھیں۔

۳ : "اسلام کے معاشی نظام میں زکوٰۃ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔" اس موضوع پر مفصل اظہارِ خیال کریں۔

۴ : حج کا فلسفہ کیا ہے؟ نیز اس کے انفرادی اور اجتماعی فوائد بیان کریں۔

۵ : جہادِ اسلامی سے کیا مُراد ہے؟ اس کی قسمیں اور فضائل بیان کریں۔

۶ : اولاد کے حقوق و فرائض قرآن وسنت کی روشنی میں واضح کریں۔

۷ : اسلام نے عورت کو معاشرہ میں کیا مقام دیا ہے؟ اس کے حقوق اور اس کی ذمہ داریاں بیان کریں۔

۸ : مندرجہ ذیل کے حقوق و فرائض پر مختصر نوٹ لکھیں۔
رشتہ دار۔ ہمسائے۔ اساتذہ۔ غیر مُسلم۔

۹ : معاشرہ کی اسلامی تشکیل کے لیے کِن اُمور کی پابندی ضروری ہے؟

۱۰ : رذائل اخلاق سے کیا مُراد ہے؟ ایسے پانچ رذائل کا ذکر کریں اور بتائیں کہ ان سے مُعاشرے میں کیسے بگاڑ پیدا ہوتا ہے؟

باب سوم

اُسوۂ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

رَحْمَۃٌ لِّلْعَالَمِیْنَ

اللہ تعالیٰ نے حضرت مُحمّد رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ (سورۃ الانبیاء:۱۰۷)

ترجمہ: ہم نے آپؐ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا۔

اور آپؐ کی زندگی کو پُوری انسانیت کے لیے نمونۂ ہدایت قرار دیا گیا ہے:۔

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ (سورۃ الاحزاب:۲۱)

ترجمہ: تمہارے لیے اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ ہے۔

اُمت پر شفقت و رحمت اللہ تعالیٰ حضرت مُحمّد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے:۔

لَقَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْہِ مَا

عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ۝ (سورۃ التوبۃ ۱۲۸)

ترجمہ: (مسلمانو!) تمہارے پاس (اللہ کا) ایک رسول آگیا ہے جو تم ہی میں سے ہے۔ تمہارا رنج و کلفت میں پڑنا اس پر بہت شاق گزرتا ہے۔ وہ تمہاری بھلائی کا بڑا ہی خواہش مند ہے۔ وہ مومنوں کے لیے شفقت رکھنے والا، رحمت والا ہے۔

حضور اکرمؐ مقروض اصحاب کا قرضہ اپنے پاس سے ادا فرماتے۔ بحالتِ ضرورت نماز و خطبہ مختصر فرما دیتے۔ یہاں تک کہ بقول حضرت عائشہ رضؓ اپنے پسندیدہ عمل کو بھی اِس لیے ترک فرما دیتے، کہ کہیں وہ عمل اُمّت پر فرض کی حیثیّت سے عائد نہ ہو جائے[1] مثلاً نماز تراویح صرف تین دن مسجد میں ادا فرمائی۔ اور ازاں بعد یہ خیال مانع ہوا کہ نماز تراویح امت پر فرض نہ کر دی جائے[2] اسی طرح اُمّت کو عبادات و معاملات میں دشواری سے بچانے کے لیے حضور اکرمؐ نے عُمر بھر فکر کی۔ مثلاً مسواک کے بارے میں فرمایا۔ اگر اُمّت کو دشواری نہ ہوتی، تو میں انھیں ہر نماز کے لیے مسواک کرنے کا حکم دیتا[3] غرضیکہ خلقِ خدا اور خالقِ ارض و سماء دونوں شاہد ہیں کہ حضورِ اکرم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ط (یعنی ایمان والوں پر نہایت شفیق مہربان ہیں۔ سورۃ التوبہ: ۱۲۸) کے بہترین مصداق تھے۔

کافروں پر رحمت

گذشتہ اُمّتیں اپنی نافرمانی اور گناہوں کے سبب مُختلف عذابوں میں مُبتلا ہوئیں

---

[1] صحیح بخاری [2] صحیحین [3] صحیح بُخاری

کسی قوم کی صورت مسخ کردی گئی۔ کسی پر طوفان کا عذاب آیا، اور کسی کی بستی کو اُلٹ دیا گیا۔ لیکن حضورِ انورؐ کے وجود کی برکت سے کفارِ مکہ باوجود اپنی سرکشی کے، دُنیا میں عذابِ عظیم سے محفوظ رہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ط (سورۃ الانفال: ۳۳)

ترجمہ: اور اللہ ہرگز عذاب نازل نہیں کرے گا جب تک کہ آپؐ ان میں موجود ہیں۔

ایک دفعہ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا۔ یا رسُولَ اللہ! آپؐ مُشرکین کے لیے بد دعا کریں۔ آپؐ نے فرمایا۔ "مَیں لعنت کرنے والا نہیں۔ بلکہ مَیں تو صرف رحمت بنا کر بھیجا گیا ہُوں۔" حضرت طفیلؓ بن عمرو دوسی کو رسُول اللہ ؐ نے قبیلہ دوس میں دعوتِ اسلام کے لیے بھیجا۔ واپسی پر اُنھوں نے عرض کیا۔ "قبیلہ دوس ہلاک ہوگیا۔" کیونکہ ان لوگوں نے نافرمانی کی، اور اطاعت سے انکار کردیا۔ لوگوں کو گمان ہُوا کہ یہ سُن کر حضرت محمّد رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم بد دعا کریں گے مگر آپؐ نے دُعا کی۔

اَللّٰهُمَّ اهْدِ دَوْسًا وَائْتِ بِهِمْ

ترجمہ: خدایا! قبیلہ دوس کو ہدایت دے اور ان کو دائرہ اسلام میں لا۔

جنگِ اُحد میں حضورِ انورؐ کے دندان مُبارک شہید ہو گئے۔ آپؐ کا چہرۂ اقدس خُون سے تر تھا مگر مخالفینِ اسلام کے لیے آپؐ کی زبانِ مُبارک پر دُعائیہ الفاظ جاری تھے۔

عورتوں پر شفقت

اِسلام سے قبل مُعاشرے میں عورتوں کی کوئی عِزّت نہ تھی۔ وہ ظلم وستم کا شکار تھیں۔ حضرت مُحمد رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے انہیں عزت واحترام بخشا اور ان کے حقوق وفرائض کا تعیّن کیا اوران کو ماں، بیٹی اور بیوی تینوں حیثیتوں سے عزّت عطا کی۔ آپؐ نے فرمایا :-

اَلْجَنَّۃُ تَحْتَ اَقْدَامِ الْاُمَّھَاتِ (سیوطی)

ترجمہ : جنّت ماؤں کے قدموں تلے ہے۔

عرب کے لوگ ننگ وعار یا بھوک اور افلاس کی وجہ سے اپنی اولاد کو قتل اور لڑکیوں کو زندہ دفن کردیتے تھے۔ آپؐ نے اس قبیح رسم کو ختم کرایا اور لڑکیوں کو گھر کی زینت اور گھر والوں کے لیے باعثِ رحمت قرار دیا۔

یتیموں کا والی

یتیموں اور غریبوں کے لیے حضرت مُحمّد رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ذات گرامی سراپا رحمت ہے۔ آپؐ سے پہلے یتیموں اور بیواؤں کا کوئی والی نہ تھا۔ آپؐ نے یتیموں کی نگہداشت کی فضیلت بیان کرتے ہُوئے انگشتِ شہادت اور درمیانی کو ملا کر فرمایا :-

اَنَا وَکَافِلُ الْیَتِیْمِ فِی الْجَنَّۃِ ھٰکَذَا (بخاری۔مُسلم)

ترجمہ : میں اور یتیم کی نگہداشت کرنے والا بہشت میں یُوں ساتھ ساتھ ہوں گے۔

حضرت اسماء رضؓ بنت عمیس (زوجہ حضرت جعفر طیار رضؓ) بیان کرتی ہیں کہ جس دن جعفر غزوۂ موتہ میں شہید ہوئے۔ حضرت مُحمّد رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم میرے ہاں تشریف لائے اور فرمایا۔ "اسماء! جعفر رضؓ کے بچّوں کو بلاؤ" میں نے ان بچّوں کو خدمت اقدس میں حاضر کیا تو آپؐ نے انہیں سینے سے لگایا اور رو پڑے۔ میں نے عرض کیا۔ یا رسُول اللہ! شاید آپؐ کو جعفر رضؓ کی طرف سے کُچھ خبر آئی ہے۔ فرمایا۔ "وہ آج شہید ہو گئے۔"

غلاموں کا مولیٰ

اُس دَور میں غلاموں کے ساتھ بڑا ظالمانہ برتاؤ کیا جاتا تھا۔ حضرت مُحمّد رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ان کے ساتھ شفقت و مہربانی کا سلُوک کرنے کی تاکید فرمائی اور حُکم دیا کہ تمہارے غلام، تمہارے بھائی ہیں جِن کو اللہ تعالیٰ نے تمہارا ماتحت بنایا۔ تم جو کھاؤ، ویسا ہی انہیں بھی کھلاؤ اور جو خود پہنو ویسا ہی انہیں بھی پہناؤ اور ان کی طاقت سے زیادہ ان پر کام کا بوجھ نہ ڈالو۔

بچّوں پر رحمت

حضرت مُحمّد رسُول اللہ صلّی اللہُ علیہ وسلّم بچّوں پر نہایت شفقت فرماتے تھے، جب آپؐ کا گذر بچّوں کے پاس سے ہوتا تو آپؐ انہیں سلام کرتے اور رُک کر پیار کرتے۔ ایک روز آپؐ حضرت حسنؓ بن علیؓ کو پیار کر رہے تھے کہ اقرع بن حابس تمیمی جو آپؐ کے پاس موجود تھے، کہنے لگے۔ "میرے دس لڑکے ہیں۔ میں نے کبھی کِسی کو یُوں پیار نہیں کیا۔" آپؐ نے فرمایا۔ مَنْ لَّا یَرْحَمْ

لَا یُرحَمُ "جو رحم نہیں کرتا، اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔"

حضرت محمّد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی شانِ رحمت یہ بھی کہ آپؐ انسان تو انسان جانوروں تک کے لیے باعثِ رحمت تھے۔

اُخوّت

حضرت مُحمّد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی تشریف آوری سے قبل عرب مُعاشرے میں جنگ و جدال کا بازار گرم تھا۔ لوگ ایک دُوسرے کے خُون کے پیاسے تھے۔ حضرت مُحمّد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے انہیں درسِ اخوّت و محبّت دیا اور مختصر سے عرصے میں مُعاشرے کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ آپؐ نے اپنے اخلاق و کردار سے دشمنوں کو دوست، بیگانوں کو یگانہ، اور خُون کے پیاسوں کو بھائی بھائی بنا دیا۔ اسی نعمتِ خداوندی کا ذکر اس آیۂ کریمہ میں کیا گیا ہے۔

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ج

(سُورۃ آل عمران: ۱۰۳)

ترجمہ: اور یاد کرو احسان اللہ کا اپنے اوپر جب کہ تھے تم آپس میں دشمن پھر اُلفت دی تمہارے دلوں میں۔ اب ہو گئے اس کے فضل سے بھائی۔

بلاشبہ اللہ تعالیٰ کا فضلِ عظیم تھا۔ یہ نعمت جو صرف اللہ تعالیٰ کی عنایت ہی سے حاصل ہوئی، دُنیا کی بڑی سے بڑی دولت سے بھی حاصل

نہیں ہو سکتی تھی جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِہِمْ ط لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِہِمْ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ اَلَّفَ بَیْنَہُمْ ط اِنَّہٗ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ○ (سُورۃ الانفال: ٦٣)

ترجمہ: اور اُلفت ڈالی ان کے دلوں میں۔ اگر تو خرچ کر دیتا جو کچھ زمین میں ہے سارا، نہ الفت ڈال سکتا ان کے دلوں میں، لیکن اللہ نے اُلفت ڈالی ان میں، بے شک وہ زور آور ہے حکمت والا۔

حضرت مُحمّد رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم مکّہ سے ہجرت فرما کر جب مدینہ تشریف لے گئے تو آپؐ نے مہاجرینِ مکّہ وانصارِ مدینہ کے درمیان "رشتۂ مواخاۃ" قائم کر دیا۔ ہر مہاجر کو کسی انصاری کا دینی بھائی بنا دیا اور اس طرح اخوّت ومحبّت کا ایسا مضبُوط رشتہ قائم فرما دیا جس کی مثال تاریخِ عالم میں نہیں ملتی انصار کے ایثار کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے مکانات، باغات اور کھیت آدھوں آدھ بانٹ کر برضا، و رغبت اپنے دینی بھائیوں کو دے رہے تھے۔ دوسری طرف مہاجرین کی خودداری کا یہ عالم تھا، کہ وہ کہتے تھے۔ ہمیں بازار کا رستہ دکھا دو ہم تجارت یا مزدوری کر کے پیٹ پال لیں گے۔ یہ مواخات ارشاد ربانی اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ (سُورۃ الحجرات: ١٠) ترجمہ: مسلمان جو ہیں سو بھائی ہیں)، کی بے مثال عملی تفسیر تھی۔

مساوات

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اپنے قول و عمل سے مساوات کا جو درس دیا ہے وہ تاریخِ انسانی میں اپنی مثال آپ ہے۔

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک امیر و غریب، شاہ و گدا، آقا و غلام سب برابر تھے۔ آپؐ نے خاندانی اور قبائلی فخر کو مٹایا، ذات پات اور رنگ و نسل کے تمام امتیازات کو ختم کر دیا۔ آپؐ کے نزدیک سلمان فارسی رضؓ، بلالِ حبشی رضؓ اور صہیب رومی رضؓ کی قدر و منزلت قریش کے معززین سے کم نہ تھی۔

مسجد، مسلمانوں کے لیے مساوات کی ایک عملی تربیت گاہ ہے۔ اور نماز مساوات کا بہترین مظہر ہے۔ خواہ امیر ہو یا غریب۔ بڑا ہو یا چھوٹا، سب ایک ہی مسجد میں نماز ادا کرتے ہیں۔ اسلام میں بزرگی کا انحصار ذات پات اور قبیلہ و خاندان کے بجائے نیکی اور تقویٰ پر ہے۔

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حقیقت کو خطبہ حجۃ الوداع میں یوں بیان فرمایا ہے:۔

"یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّ رَبَّکُمْ وَاحِدٌ وَّاِنَّ اَبَاکُمْ وَاحِدٌ

اَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِیٍّ عَلٰی عَجَمِیٍّ وَّلَا لِعَجَمِیٍّ عَلٰی عَرَبِیٍّ

وَلَا لِاَحْمَرَ عَلٰی اَسْوَدَ وَلَا لِاَسْوَدَ عَلٰی اَحْمَرَ اِلَّا بِالتَّقْوٰی"۔

ترجمہ: اے لوگو! تم سب کا پروردگار ایک ہے۔ اور تم سب کا باپ (آدمؑ)

ایک ہی ہے۔ پس کوئی فضیلت نہیں عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر

سرخ کو کالے پر، کالے کو سرخ پر، سوائے تقویٰ کے!

مساوات کا عملی مظاہرہ اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب رضؓ کی شادی، اپنے آزاد کردہ غُلام حضرت زید رضؓ سے کردی۔ اس طرح آپؐ نے اپنے بیٹھنے کے لیے کوئی نمایاں جگہ مخصوص نہیں کی۔ بلکہ صحابۂ کرام رضؓ کے درمیان بے تکلفی سے بیٹھ جایا کرتے تھے۔ آپؐ کا لباس عام مسلمانوں کے لباس جیسا ہوتا تھا۔ آپؐ کا مکان نہایت سادہ اور مُختصر سا تھا۔ اور آپؐ کی غذا بہُت سادہ ہوتی تھی۔

مسجد قُبا اور مسجدِ نبویؐ کی تعمیر کے وقت حضرت مُحمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم نے صحابۂ کرام کے ساتھ مل کر کام کیا۔ اس طرح غزوۂ احزاب کے موقع پر بھی آپؐ عام مسلمانوں کے ساتھ خندق کھودنے میں شریک رہے۔

صبر و استقلال

صبر کے لغوی معنی، روکنے اور برداشت کرنے کے ہیں۔ یعنی اپنے نفس کو خوف اور گھبراہٹ سے روکنا اور مصائب و شدائد کو برداشت

کرنا۔ استقلال کے لغوی معنی استحکام اور مضبوطی کے ہیں۔ الغرض صبر و استقلال، دل کی مضبوطی، اخلاقی بلندی اور ثابت قدمی کا نام ہے۔ قرآن مجید میں صبر کی بڑی فضیلت اور اہمیت بیان کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے :۔

وَاصْبِرْ عَلٰی مَآ اَصَابَکَ ط اِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ؀ (سورۃ لقمان: ۱۷)

ترجمہ: اور جو مصیبت آپ کو پیش آئے، اسے برداشت کرو۔ یہ بڑے عزم کی بات ہے۔

دُوسری جگہ پر فرمایا گیا:۔

اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ؏ (سورۃ البقرۃ: ۱۵۳)

ترجمہ: بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مصیبت اور پریشانی کے وقت اپنے بندوں کو صبر و رضا کی تاکید کی ہے۔ اور چونکہ انسان کی جان اور اس کا مال سب اللہ کا عطا کردہ ہے اس لیے انسان پر لازم ہے کہ آزمائش کے وقت رضائے الٰہی کی خاطر صبر و سکون سے کام لے۔ جب حضرت محمّد صلی اللہ علیہ وسلّم نے نبوّت کا اعلان فرمایا تو کُفّار نے آپؐ کو طرح طرح کی اذیّتیں دیں۔ آپؐ کو جھٹلایا۔ آپؐ کا مذاق اڑایا۔ کسی نے (معاذ اللہ) جادُوگر کہا اور کسی نے کاہن، مگر آپؐ نے صبر و استقلال کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور تبلیغ دین سے مُنہ نہ موڑا۔

ایک دن حضرت مُحمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم خانہ کعبہ کے

نزدیک نماز پڑھ رہے تھے۔ حرم شریف میں اُس وقت کفّار کی ایک جماعت موجود تھی۔ عقبہ بن ابی مُعیط نے ابوجہل کے اکسانے پر اونٹ کی اوجھڑی سجدہ کی حالت میں آپؐ کی پشت مبارک پر ڈال دی اور مشرکین زور زور سے قہقہے لگانے لگے۔ کسی نے آپؐ کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ کو اس واقعہ کی اطلاع دی وہ فوراً دوڑی ہوئی آئیں، اور غلاظت آپؐ کی پشت سے دُور کی اور ان کافروں کو بد دُعا دی۔ اس پر حضرت مُحمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا۔ "بیٹی صبر سے کام لو۔ اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت دے۔ یہ نہیں جانتے کہ ان کی بہتری کس چیز میں ہے۔"

ابولہب حضورؐ کا چچا تھا۔ لیکن جب سے حضرت مُحمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم نے تبلیغِ دین شروع کی وہ اور اس کی بیوی اُمِ جمیل دونوں آپؐ کے دشمن ہوگئے۔ ابُولہب نے یہ کہنا شروع کیا۔ "لوگو! (معاذ اللہ) یہ دیوانہ ہے۔ اس کی باتوں پر کان نہ دھرو۔" اُس کی بیوی حضورؐ کے راستے میں کانٹے بچھاتی تھی۔ کئی مرتبہ آپؐ کے تلوے لہولہان ہوگئے۔ مگر آپؐ نے نہایت صبر و استقلال کے ساتھ اس تکلیف کو برداشت کیا۔ کبھی بد دعا کے لیے ہاتھ نہ اُٹھائے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کی اس گستاخی پر ان کی مذمّت میں سُورۂ لہب نازل کی۔

دشمنانِ حق نے جب یہ دیکھا، کہ ان کی تمام تدبیروں کے باوجود حق کا نُور چاروں طرف پھیلتا جا رہا ہے تو انھوں نے نبوّت کے ساتویں برس مُحرّم الحرام میں خاندان بنو ھاشم سے قطع تعلق کرلیا، جس کی رُو سے تمام قبائلِ عرب کو اس بات کا پابند کیا گیا، کہ وہ بنوہاشم سے ہرطرح کا لین دین اور میل جول بند کردیں اور ابولہب کے سوا پورا

خاندان بنو ہاشم تین سال تک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ شعب ابی طالب میں محصور رہا۔ اس دوران انھوں نے اتنی تکلیفیں اُٹھائیں جن کے تصوّر سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مگر اس موقع پر "رحمۃ للعالمین" نے نہایت صبر وضبط اور بڑی پامردی و استقامت سے ان حالات کا مقابلہ کیا۔ اس طرح آپؐ اور آپؐ کے جاں نثار صحابہ کرامؓ بھی رضائے الٰہی کی خاطر مصرُوفِ جہاد رہے اور اس راہ میں پیش آنے والی تمام تکلیفوں کو بے مثال صبر و استقامت سے برداشت کرتے رہے۔

عفو و درگذر

عفو و درگذر ایک بہترین اخلاقی وصف ہے۔ اس سے دوستوں اور عزیزوں کی محبّت بڑھتی ہے اور دشمنوں کی عداوت دُور ہو جاتی ہے۔ قرآن مجید میں مُختلف مقامات پر اس کی تاکید کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی جن صفات کو پسندیدہ فرمایا ہے ان میں عفو و درگزر بھی ہے۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے۔

وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ ط (سُورۃ آل عمران: ۱۳۴)

ترجمہ: اور دبا لیتے ہیں غصہ اور معاف کرتے ہیں لوگوں کو۔

حضرت مُحمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم نے قریش کی شدید مخالفت کو دیکھ کر وادی طائف کا قصد کیا۔ تاکہ وہاں کے رہنے والوں

کو دینِ اسلام کی دعوت دیں۔ طائف کے سرداروں نے حضرت محمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم کی دعوت پر لبّیک کہنے کی بجائے آپؐ سے نہایت غیر مُہذّب اور ناشائستہ برتاؤ کیا۔ آپؐ پر اتنے پتھر برسائے کہ آپؐ کا جسمِ مبارک لہولہان ہوگیا۔ حتّٰی کہ آپؐ کے جُوتے خُون سے بھر گئے۔ اس موقع پر جبریلِ امینؑ تشریف لائے اور انہوں نے عرض کیا۔ "اگر آپؐ حُکم دیں تو طائف کے دونوں جانب کے پہاڑوں کو ملا دوں، تاکہ سرکش لوگ نیست و نابُود ہو جائیں۔" مگر حضُور نے نہ صرف یہ کہ انہیں مُعاف فرمایا بلکہ ان کے حق میں دُعا فرمائی۔ "اے اللہ! ان کو ہدایت عطا فرما۔" فتح مکّہ کے موقع پر صحنِ کعبہ میں قریشِ مکّہ کا اجتماع تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو آپؐ کے قتل کے منصُوبے بناتے رہے تھے۔ انہوں نے کتنے ہی مُسلمانوں کو شہید کر دیا تھا۔ اور حضرت مُحمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم اور مسلمانوں کو اتنی اذیّتیں پہنچائی تھیں کہ انہیں مکّے سے مدینے ہجرت کرنی پڑی۔ اب یہ لوگ خوف و دہشت کی تصویر بنے ہُوئے تھے۔ اور ڈر رہے تھے کہ نہ جانے اب ان سے کتنا شدید انتقام لیا جائے گا۔ حضرت مُحمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ان کی طرف توجہ کی اور فرمایا:-

"اے گروہِ قریش! تم جانتے ہو میں تمہارے ساتھ کیا برتاؤ کرنے والا ہُوں؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "آپؐ نیکی کا برتاؤ کریں گے۔ کیونکہ آپؐ خُود مہربان ہیں اور مہربان بھائی کے بیٹے ہیں۔"

آپؐ نے قرآن شریف کی یہ آیت پڑھی:-

لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ط يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ز

وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝ (سورۃ یوسف: ۹۲)

ترجمہ: کچھ الزام نہیں تم پر آج ، بخشے اللہ تم کو اور وُہ ہے سب مہربانوں سے مہربان۔

ذِکر

ذکر کے معنی ہیں کِسی کو یاد کرنا۔ دین کی اصطلاح میں اس سے مُراد اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا ہے۔ قرآن مجید میں اکثر مقامات پر ذکرِ الٰہی کی تلقین کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِیْرًا ۙ (سورۃ الاحزاب: ۴۱)

ترجمہ : اے ایمان والو ! اللہ کو بہت کثرت سے یاد کرو۔

نیز ذکر کرنے والے مومنوں کی تعریف قرآن مجید میں اس طرح کی گئی :۔

رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِیْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (سورۃ النور: ۳۷)

ترجمہ: وہ مرد کہ نہیں غافل ہوتے سودا کرنے میں اور نہ بیچنے میں اللہ کی یاد سے :

ایک اور جگہ اس طرح ارشاد ہوا :۔

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ؕ (سورۃ الرعد : ۲۸)

ترجمہ: خوب سن کہ اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان ہو ہی جاتا ہے۔

ذکر کی افضل ترین شکل نماز ہے۔ کیونکہ اس میں ذکر کی تینوں قسمیں (قلبی، لسانی، عملی) جمع ہو گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اور عبادات میں سب سے پہلے نماز ہی فرض کی گئی۔ ام المومنین حضرت عائشہ رض روایت کرتی ہیں۔ کہ رسول اللہ ص رات کو اتنی دیر تک کھڑے ہو کر عبادت کیا کرتے کہ آپ کے پائے مبارک میں ورم آجاتا۔ ایک مرتبہ میں نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! آپ کے لیے اللہ تعالیٰ نے جنت لکھ دی۔ پھر آپ اتنی مشقت کیوں برداشت کرتے ہیں؟ حضور انور ص نے فرمایا "کیا میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟

آپ کی عبادت کا تذکرہ قرآن مجید میں اس طرح آیا ہے :۔

يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۙ (سورۃ المزمل: ۱:۲)

ترجمہ: اے کپڑے میں لپٹنے والے کھڑا رہ رات کو مگر کسی رات، آدھی رات یا اس میں سے کم کر دے تھوڑا سا۔

دوسری جگہ اس طرح ارشاد فرمایا گیا ہے :۔

وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا (سورۃ الدھر: ۲۶)

ترجمہ: اور کسی وقت رات کو سجدہ کر اس کو اور پاکی بول اس کی بڑی رات تک۔

نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم مختلف طریقوں سے اللہ کا ذِکر فرمایا کرتے تھے اور فرض نمازوں کے ساتھ نوافل کا بھی اہتمام فرماتے۔ کیونکہ قرآنِ حکیم میں آیا ہے :۔

وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ۝ (سورۃ الاسراء : ۷۹)

ترجمہ : اور رات کے کُچھ حصہ میں ۔ سو اس میں تہجد پڑھ لیا کیجئے جو آپ کے حق میں زائد چیز ہے۔ عجب کیا کہ آپؐ کا پروردگار آپؐ کو مقامِ محمُود میں جگہ دے۔

نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا۔ اَفْضَلُ الذِّكْرِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ یعنی بہترین ذکر لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے ۔ نماز کے بعد تینتیس، تینتیس بار سُبْحَانَ اللّٰهِ اور اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ اور چونتیس بار اَللّٰهُ اَكْبَرُ کہنا بھی ذکرِ الٰہی ہے۔ اس ذکر کا نام تسبیح فاطمہ ہے۔ ذکر کے اور بھی بہت سے مسنون طریقے ہیں، جو حدیث کی کتابوں میں مذکور ہیں۔

سوالات

۱ : مندرجہ ذیل پر مختصر نوٹ لکھیں :۔ حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی (ا) عورتوں پر شفقت (ب) بچوں سے پیار (ج) امت پر شفقت و رحمت ۔

۲ : "اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ" حضور اکرم نے اس حکم قرانی کے تحت اختلاف رنگ و نسل مٹا کر تمام مسلمانوں کو بھائی بھائی بنا دیا۔" اس پر مُفصّل تبصرہ کریں۔

۳ : مساوات کسے کہتے ہیں؟ رسولِ کریمؐ نے اسلامی معاشرے میں مساوات کیسے قائم کی؟

۴ : عفو و درگزر سے کیا مراد ہے؟ اس سے انسانی مُعاشرے پر کیا اثرات مُرتب ہوتے ہیں؟ رسُولِ پاکؐ کے عفو و درگزر کے چند واقعات تحریر کریں۔

۵ : ہمارے نبی صبر و استقلال کا پہاڑ تھے۔ مثالوں کے ذریعے اس کی تشریح کریں۔

۶ : ذکر سے کیا مُراد ہے ؟ ذکرِ الٰہی کی اقسام اور اس کے فضائل تحریر کریں۔

باب چہارم

تعارفِ قرآن وحدیث

تعارفِ قرآن

قرآنِ مجید کی تعریف

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا آخری کلام ہے جو آخری پیغمبر حضرت محمّد مُصطفیٰ صلّی اللہ علیہ وسلّم پر تیئس سال کی مُدّت میں آہستہ آہستہ، حالات و ضرورت کے پیشِ نظر نازل ہوتا رہا۔ یہ نہایت ہی پاکیزہ اور مقدّس کتاب ہے جس میں سب انسانوں کے لیے ہدایت کا پیغام ہے۔ قرآن کے علاوہ بھی چند دیگر آسمانی کتابیں ہیں جو پہلے زمانے میں رسُولوں پر نازل ہُوئیں۔ مثلاً تورات، زبُور، انجیل۔ اس کے علاوہ صحیفے بھی ہیں جو دُوسرے پیغمبروں پر نازل ہُوئے۔ سب آسمانی کتابوں میں بنیادی تعلیمات مثلاً توحید۔، ردِ شرک، اخلاق و عبادات سے متعلق احکام مشترک رہے ہیں۔ مگر وہ تمام سابقہ کتابیں ایک خاص دَور کے لیے تھیں۔ یہ چونکہ پُوری دُنیائے انسانیت کے لیے نہ تھیں، اس لیے ان کے اکثر احکام بھی ایک خاص وقت کے لیے تھے، جو دُوسرے زمانے کے لیے قابلِ عمل نہ تھے، مگر قرآن مجید ایک ایسی جامع کتاب ہے، جو زندگی کے ہر شعبہ میں رہنمائی کرتی ہے اور اس کی یہ رہنمائی کسی خاص

وقت اور قوم کے لیے نہیں، بلکہ قیامت تک کی تمام دُنیائے انسانیت کے لیے ہے۔ قرآن مجید آخری پیغمبر محمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم پر نازل ہونے والی آخری کتاب ہے۔ اس کے بعد کسی دوسری کتاب کے نزول کی کوئی گنجائش نہیں۔

قرآن مجید کے اسما

قرآن مجید کے اسما کے بارے میں علما کے کئی اقوال ہیں جن میں سے کتاب البرہان کا بیان بھی ہے کہ قرآن کریم کے پچپن نام ایسے ہیں جو خود آیاتِ قرآنیہ سے ماخوذ ہیں۔ ان میں سے چند اسما مبارکہ مندرجۂ ذیل فہرست میں مذکور ہیں۔

۱ : الکتاب : دُنیا کی تمام کتابوں میں کتاب کہلانے کا مستحق قرآن ہی ہے۔

۲ : الفُرقان : سچ اور جھوٹ میں فرق کرنے والی۔

۳ : نُور : روشنی اور ہدایت دکھانے والی

۴ : شِفاء : روحانی شفاء اور پیغامِ صحّت

۵ : تذکرہ : عبرت و نصیحت کا سامان۔

۶ : العلم : یہ کتاب سراپا علم و معرفت ہے۔

۷ : البیان : اس کتاب کی ہر تعلیم وضاحت سے پیش کی جاتی ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے قرآن کی چند صفتوں کا بھی بیان فرمایا ہے مثلاً :-

حکیم : حکمت والا

مَجید : بزرگ

مبارک : بابرکت۔

العزیز : زبردست عزّت والا

مُبین : ہدایت کو واضح کرنے والا

کریم : کرامت اور بزرگی والا۔

اس کتاب کی خوبیوں کا کوئی اندازہ نہیں کرسکتا۔ اس کے مضامین و مطالب کی کوئی حد نہیں۔ کوئی شخص بھی جس کے دل میں ہدایت کی سچی تڑپ ہو وہ اپنی فہم کے مُطابق اس سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔

قُرآنِ مجید کا نزُول

حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کی عمر جب چالیس سال کی تھی تو آپ پر قرآن مجید کا نزول شرُوع ہُوا۔ عُمر کے اس حصّے میں آپ زیادہ تر تنہائی میں رہتے تھے۔ آپؐ عبادت کی خاطر غارِ حرا میں تشریف لے جاتے۔ ایک بار جب آپؐ غار میں مصرُوفِ عبادت تھے تو اچانک جبریلِ امین غار میں وہاں نے پر تشریف لائے اور کہا کہ حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم پڑھ، آپؐ نے فرمایا کہ میں پڑھا لکھا نہیں۔ تین بار یہی سوال وجواب ہوتا رہا۔ چوتھی بار جبریل امینؑ نے آپؐ کو پکڑ کر دبایا اور چھوڑ دیا اس کے بعد سورۃ علق کی ابتدائی یہ پانچ آیتیں پڑھیں :-

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۚ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ؕ (سورۃ العلق : ۱ تا ۵)

ترجمہ: پڑھ اپنے رب کے نام سے جو سب کا بنانے والا ہے۔ بنایا آدمی کو جمے ہُوئے لہُو سے، پڑھ اور تیرا رب بڑا کریم ہے۔ جس نے علم سکھایا قلم سے، سکھایا آدمی کو جو وہ نہ جانتا تھا۔

وحی کی ابتدا آپؐ پر بوجھ ثابت ہُوئی۔ آپؐ پر کپکپی طاری ہو گئی اور آپؐ سیدھے اپنے گھر تشریف لے آئے۔ اپنی زوجہ محترمہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو سارا واقعہ سُنایا۔ آپؐ کی اطاعت شِعار زوجہ محترمہ نے آپؐ کو ان الفاظ میں تسلّی دی۔ "آپؐ کو اللہ تعالیٰ ہرگز ناکام نہیں کرے گا۔ آپؐ رشتہ داروں کو باہم جوڑتے ہیں۔ آپؐ لوگوں کی مشکلات کا بوجھ برداشت کرتے ہیں۔ آپؐ فقیروں کو مال عطا کرتے ہیں اور مہمان نواز ہیں۔" حقیقت میں حضرت خدیجہؓ کے یہ الفاظ ہم سب مسلمانوں کے لیے درس کا کام دیتے ہیں۔ اگر ہم میں سے کوئی ان خوبیوں کو اختیار کرے تو اسے یقین رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اسے عملی زندگی میں ناکام نہیں کرے گا، بلکہ اسے مشکلات سے نجات دے گا۔

مکّی سُورتوں کی خصُوصیّات

حضور اکرمؐ نے مکّے میں تیرہ سال گذارے اس دوران آپؐ کو بے حد مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑا، کیونکہ اپنے جلنے پہچانے لوگ جن سے آپؐ کو امید تھی کہ وہ آپؐ کی دعوت سن کر آپؐ پر ایمان لائیں گے، بیگانے ہو گئے۔ انہیں توحید کی دعوت سُننا گوارا نہ تھا، اس لیے کہ وہ شرک کی بیماری میں مُبتلا تھے۔ انہوں نے نہایت سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا کہ وہ آپؐ کی دعوتِ حق کو

نہیں مانیں گے، بلکہ آپؐ کی مخالفت، جس قدر ان سے ہوسکی، کریں گے۔ چنانچہ اس مُخالفت میں وہ لوگ آپؐ کی راہ میں کانٹے بچھاتے۔ آپؐ جب قرآن پڑھتے تو درمیان میں چیختے چلّاتے، تاکہ لوگ قرآن نہ سنیں۔ جو اللہ کے بندے آپؐ پر ایمان لاتے تھے انہیں مارتے پیٹتے۔ یہ تیرہ سال کا زمانہ انتہائی مشکلات و مصائب کا زمانہ تھا۔ اس دور میں قرآن کا جو حصہ نازل ہُوا اس میں آپؐ کو صبر کی بھی تلقین کی گئی۔ اس کے ساتھ ہی توحید و رسالت، آخرت کے مضامین بھی بیان کیے گئے ہیں۔ مکّے میں تیرہ سال گزارنے کے بعد آپؐ کو مدینے کی طرف ہجرت کرنے کا حکم ہُوا۔

مدنی سورتوں کی خصوصیّات

ہجرت کے بعد آپؐ جب مدینے تشریف لائے تو صورتِ حال مُختلف تھی۔ آپؐ کی تشریف آوری سے قبل ہی آپؐ کی دعوتِ حق یہاں پہنچ گئی تھی اور مدینے کے کچھ لوگ مسلمان ہوگئے تھے۔ ہجرت کے بعد جب مسلمانوں کی ایک مختصر جماعت آپؐ کی رہنمائی میں مکّے سے ہجرت کرکے مدینے پہنچی تو آپؐ نے مہاجرین و انصار کی مدد سے ایک اسلامی ریاست قائم فرمائی۔ اس دوران نئی نئی ضروریات کے پیشِ نظر جو سورتیں اور آیتیں نازل ہُوئیں ان میں معاشرتی، معاشی سیاسی قسم کے مسائل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے کی فضیلت، عدل و احسان کا حکم، تجارت میں لین دین کے احکام اور جہاد کی فرضیّت کا حکم نازل ہُوا۔ عبادات میں روزہ، زکوٰۃ اور حج بھی فرض ہوا۔ حضورؐ نے مدینہ میں دس سال گزارے۔ اس

دوران میں مختلف موقعوں پر قرآن مجید کی آیتیں اور سورتیں نازل ہوتی رہیں۔ اسی زمانے میں مسلمانوں کی کفّار سے لڑائیاں بھی ہُوئیں۔ سب سے پہلے جو لڑائی کفّار سے ہُوئی، اُسے غزوہ بدر کہتے ہیں۔ سب سے آخر میں غزوہُ تبوک واقع ہوُا۔

حضرت مُحمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم کا آخری حج

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے دس ہجری میں آخری حج ادا کیا۔ جسے حجۃ الوداع کہتے ہیں۔ گذشتہ تئیس سال کی مُدّت میں آپؐ کی بعثت کا کام مکمل ہو گیا تھا۔ آپؐ کے ہاتھوں دین و شریعت کی تکمیل ہو گئی۔ آپؐ نے عملاً ایک اسلامی ریاست قائم کر کے مسلمانوں کی رہنمائی کا حق ادا کر دیا۔ آپؐ نے اس آخری حج کے دوران میں میدانِ عرفات میں ایک خطبہ ارشاد فرمایا جو نہایت ضروری احکام اور نصیحتوں پر مشتمل ہے۔ آپؐ نے صحابہؓ کی بہُت بڑی تعداد کو مخاطب کر کے فرمایا۔ اَلَاھَلْ بَلَّغْتُ؟ آگاہ رہو۔ کیا میں نے دین کے احکام پہنچا دیئے؟ سب نے جواباً عرض کیا۔

قَالُوْانَعَمْ۔ قَدْ بَلَّغْتَ الرِّسَالَۃَ وَاَدَّیْتَ الْاَمَانَۃَ وَنَصَحْتَ الْاُمَّۃَ۔

ترجمہ: وہ بولے ہاں حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم آپ نے رسالت پہنچا دی امانت ادا کر دی اور نصیحت فرما دی۔

آپؐ کا یہ خطبہ ظاہر کر رہا تھا کہ اب آپؐ اپنا کام مکمّل کر کے دُنیا کو چھوڑنے والے ہیں۔ اسی خاطر آپؐ نے اتنی بڑی تعداد میں مسلمانوں کو آخری بار خطاب فرمایا۔ اس کے بعد آپؐ پر وحی نازل ہُوئی جس میں دین کے مکمّل ہونے کا اعلان تھا۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ

نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ؕ (سورۃ المائدۃ : ۳)

ترجمہ: آج میں پُورا کر چکا تمہارے لیے دین تمہارا اور پورا کیا تم پر میں نے احسان اپنا اور پسند کیا میں نے تمہارے واسطے اسلام کو دین۔

اس آیت کے نازل ہونے کے تھوڑے عرصہ بعد آپؐ دُنیا سے تشریف لے گئے۔ رحلت سے قبل آپؐ نے اُمّت کو قرآن مجید کے بارے میں خصوصی وصیّت فرمائی کہ اسے میں تمہارے درمیان چھوڑ کر جا رہا ہُوں۔ اسے مضبُوطی سے پکڑنا۔ اس لحاظ سے ہم سب مسلمانوں پر لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس آخری کتاب کے احترام کے ساتھ ساتھ اس کی ہدایات پر بھی عمل کریں۔

قرآنِ مجید کی سُورتیں اور آیات

قرآن مجید ایک سَو چودہ سورتوں پر مشتمل ہے۔ اور ہر سورت جملوں پر مشتمل ہے جن کو آیات کا نام دیا گیا ہے، یہ آیت کی جمع ہے۔ آیت کے معنی نشانی کے ہیں۔ گویا ہر آیت اللہ کے کسی ابدی قانون کے لیے ایک نشانی کا درجہ رکھتی ہے۔ قرآن

مجید کی آیات کی کل تعداد چھے ہزار چھے سو چھیاسٹھ ہے۔ اس میں سورۃ توبہ کے سوا ہر ایک سورت کے شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھا ہوا ہے۔ قرآن مجید کی سورۃ بقرۃ سب سے بڑی ہے اور سورۃ الکوثر سب سے چھوٹی ہے۔ جس کی تین آیتیں ہیں۔ سارے قرآن کو تیس حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر حصے کو پارہ کہتے ہیں۔ قرآن مجید کی سات منزلیں ہیں۔ یہ منزلیں اس لیے مقرر کی گئی ہیں۔ تاکہ جو لوگ ہفتے میں قرآن ختم کرنا چاہیں ان کے لیے آسانی رہے۔

قرآنِ مجید کی حفاظت

قرآن مجید کی حفاظت کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے۔

ارشادِ خداوندی ہے:۔

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُونَ ۝ (سورۃ الحجر: ۹)

ترجمہ: ہم نے آپ اتاری ہے یہ نصیحت اور ہم آپ اس کے نگہبان ہیں۔

اس آیت میں تین باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں۔

اوّل یہ کتاب اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی۔ یعنی معمولی درجہ کی کتاب نہیں، بلکہ سب سے بلند و بالا ہستی نے، جو تمام قوتوں کا مالک ہے، انسانوں کی رہنمائی کے لیے اسے نازل فرمایا ہے۔

دُوم یہ کتاب ذکر ہے۔ ذکر کے معنی نصیحت کے ہیں۔ یعنی یہ کتاب لوگوں کی نصیحت اور بھلائی کی خاطر نازل کی گئی ہے۔

تیسری بات یہ ارشاد فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی اس کتاب کی حفاظت کا ذمہ اٹھایا ہے۔ یعنی اس کتاب کو قطع و بُرید اور تحریف سے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا گیا ہے۔ بر خلاف دوسری آسمانی کتابوں کے کہ وہ تحریف کے عمل سے بچ نہیں سکیں۔ یہ حقیقت ہے کہ قرآن جس شان سے اترا ہے بغیر کسی تبدیلی کے اب بھی اپنی اصلی حالت میں موجود ہے۔ اگرچہ اس کے نازل ہونے کے بعد سے اس وقت تک بڑی مُدت گزر چکی ہے۔ اس کی زبان فصاحت و بلاغت، اصُول و احکام اپنی جگہ قائم ہیں۔ مزید یہ کہ زمانہ کتنا ہی گزر جائے اور تقاضے اور ضروریات کتنی ہی بدل جائیں، لیکن قرآن ہر زمانے کی ضرورت کے ساتھ ساتھ انسان کی رہنمائی کرتا ہے۔ سلطنتیں اور حکومتیں قرآن کو دبانے کی کتنی ہی کوشش کریں اس کی آواز دب نہیں سکتی۔ غرضیکہ حفاظتِ قرآن کا وعدہ الٰہی ایسی صفائی اور حیرت انگیز طریقے سے پورا ہو کر رہا کہ اس کے مقابل بڑے بڑے مخالفوں کے سر نیچے ہو کر رہے۔ اپنے تو اپنے رہے، غیروں نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا۔ ایک دُوسرے مقام پر ارشاد فرمایا۔ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۝ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۝ (سُورۃ القیمۃ: ۱۶-۱۹)

ترجمہ: اِس وحی کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دو اِس کو یاد کرا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے۔ لہذا جب ہم اسے پڑھ رہے ہوں اُس وقت آپ اس کی قرأت کو غور سے سنتے رہیں پھر اِس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ہی ذمّہ ہے۔

خود حضرت محمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس کو یاد کرنے اور لکھنے کا اہتمام فرمایا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرات صحابہ رضؓ کی بڑی تعداد حافظِ قرآن تھی۔ اس کے علاوہ قرآن مجید پتھر کی سلوں، کھجور کے پتوں، اُونٹ کے شانہ کی ہڈی پر مختلف اجزاء کی صُورت میں لکھا ہُوا موجُود تھا۔

قرآن مجید کی ترتیب

قرآن مجید کی موجودہ ترتیب توقیفی ہے۔ یعنی خود حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم نے حکمِ الٰہی کے مُطابق اس کی ترتیب کا اہتمام فرمایا۔ جب کوئی سُورت نازل ہوتی تو آپؐ خود کاتبانِ وحی سے فرمایا کرتے تھے کہ اس سورت کو فلاں فلاں سورت کے شروع یا آخر میں درج کردو، اور کبھی آیات نازل ہوتیں تو آپؐ خود فرمایا کرتے تھے کہ ان کو فلاں فلاں سورت میں درج کردو۔ ان باتوں کی موجُودگی میں مسلمانوں کا ہمیشہ یہ عقیدہ رہا ہے کہ یہ ترتیب توقیفی ہے۔ حضورؐ کے کاتبان وحی میں چند حضرات صحابہ رضؓ کا ذِکر ملتا ہے، جن میں خلفائے اربعہ بھی ہیں۔

عہدِ صدّیقی میں قرآن مجید کی جمع وتدوین

حضورؐ کی حیات مبارکہ میں اگرچہ قرآن حکیم پُوری ایک کتاب کی صورت میں نہ تھا بلکہ

مختلف چیزوں پر لکھا ہوا موجود تھا۔ اسے ایک کتاب کی صورت میں مُدوّن کرنے کی ضرورت حضرت ابُوبکر رضؓ کے زمانے میں ہُوئی۔ آپؓ کی خلافت کے دَور میں مسلمانوں کی جنگ مسیلمہ کذّاب کے ساتھ ہُوئی، جِس نے جھوٹی نبوّت کا دعوٰی کیا تھا۔ چنانچہ اس کی سرکوبی کے لیے آپؓ نے ایک لشکر بھیجا، جس میں اکثر حفّاظِ قرآن بھی تھے۔ اس جنگ میں بیشتر حفّاظِ قرآن شہید ہُوئے۔ اگرچہ مسلمانوں کو فتح ہُوئی تاہم مرکزِ خلافت میں اس خطرہ کے پیش نظر کہ کہیں حُفّاظِ قرآن کے جانے سے قرآن مجید ضائع نہ ہو جائے۔ حضرت ابوبکر صدیق نے اس کی تدوین کا کام ایک مشہور قاری و حافظ صحابی زید بن ثابتؓ کے سپرد کیا جو عہدِ رسالت میں اکثر و بیشتر کتابت وحی کی خدمت انجام دیا کرتے تھے جِس کو انھوں نے نہایت محنت سے بڑی خوبی کے ساتھ تکمیل کو پہنچا دیا۔ پھر قرآن کریم کا یہ نسخہ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے پاس رہا اور آپ کی وفات پر حضرت عمر رضؓ کے پاس آگیا اور حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد ام المومنین رضؓ حضرت حفصہ رضؓ کی تحویل میں آ گیا۔ پھر حضرت عثمان رضؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں حضرت ام المومنینؓ سے اس مصحف کو منگوا کر اس کی متعدّد نقلیں اپنی نگرانی میں تیار کرائیں اور تمام قلمروِ خلافت میں اس کے نسخے بھجوا دیئے۔

قرآن کا اندازِ بیان

قرآن کا انداز بیان بے حد پیارا اور دلکش ہے جو اسے پڑھتا ہے اس کی طرف سُننے کے لیے مائل ہو جاتا ہے۔ اس کلام میں بلا کی تاثیر ہے۔ دل کی گہرائیوں میں اترتا ہے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے جملوں میں بے شمار معانی و

مطالب پوشیدہ ہیں۔ اسی خاطر شروع سے تفسیر کرنے والوں نے، اس کی تفسیر لکھنے میں عمریں خرچ کر ڈالیں۔ اور یہ سلسلہ برابر چلتا جا رہا ہے۔ قرآن کا انداز بیان دنیا کی تمام دوسری کتابوں سے بالکل جدا ہے۔ یہ براہِ راست انسان کو خطاب کرتا ہے اور اسے سیدھی راہ کی طرف بلاتا ہے۔ یہ کتاب ہر قسم کی خامیوں سے پاک سمجھی گئی ہے اور اس کی تلاوت شروع سے مسلمان کثرت سے کرتے آئے ہیں۔ یہ دلیل ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا برحق کلام ہے اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی ممکن نہیں۔

قرآنِ مجید کی خوبیاں

قرآن مجید میں ایسی خوبیاں موجود ہیں جن کے سبب یہ کتاب زندہ جاوید بن گئی ہے۔ ان تمام خوبیوں کا شمار ناممکن اور محال ہوگا۔ تاہم چند خوبیوں کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

۱ : قرآنِ مجید ایک سچی کتاب ہے۔ اس کی دعوت اور پیغام بھی سچائی سے بھرپور ہے۔ اس کے دلائل نہایت مضبوط اور مستحکم ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :-

الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۙ (سورۂ ھود : ۱)

ترجمہ : یہ ایک کتاب ہے جس کی آیتیں حکمت بھری ہیں۔ پھر حکمت والے خبردار کی طرف سے کھول کر بیان کی گئیں۔

چونکہ دلائل نہایت مضبوط ہیں اور سچائی کی طرف رہنمائی کرتے ہیں اس لیے تضاد سے پاک ہیں۔ اس کے مضامین میں ذرہ بھر بھی اختلاف نہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :-

لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا○ (سورة النّساء : ٨٢)

ترجمہ : اگر یہ ہوتا کسی اور کا سوائے اللہ کے تو ضرور پاتے اِس میں بہت تفاوت۔

٢ : اس کتاب نے ان افراد اور اقوام کی کامیابی کی ضمانت دی ہے، جو سچے دل سے اس پر ایمان لاتے ہیں اور اس کے احکام پر عمل کرتے ہیں۔ بلکہ ان کے لیے یہ کتاب اس جہان میں بھی شرف و امتیاز کا وعدہ کرتی ہے۔ اس حقیقت کو حضرت عُمر رضؓ نے یوں ارشاد فرمایا ہے۔ "اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعے کتنی ہی قوموں کو بلندی بخشے گا، اور کتنوں کو پست کرے گا۔" (صحیح مُسلِم)

حضرت عمر رضؓ کی زندگی کو ہی لیجئے اس کتابِ ہدایت کا اثر تھا۔ جس نے حضرت عمر رضؓ کی زندگی کو یکسر بدل دیا۔ وہ عمرؓ جو اپنے باپ خطاب کی بکریاں چرایا کرتے تھے اور ان کے باپ انہیں جھڑکا کرتے تھے اور یہ قوت و عزم میں قریش کے متوسط لوگوں میں سے تھے۔ یہ وہی عُمرؓ ہیں جو سلام قبول کر لینے کے بعد تمام عالم کو اپنی عظمت و صلاحیت سے متحیّر کر دیتے ہیں اور قیصر و کسریٰ کو تاج و

تخت سے محروم کردیتے ہیں اور اس کے مقابل ایک ایسی اسلامی سلطنت کی بُنیاد ڈالتے ہیں جو دونوں حکومتوں پر حاوی ہے۔ تدبیرِ سلطنت میں ہمیشہ کے لیے وہ رہنما اصُول مقرر کرتے ہیں، جن پر ساری دُنیا فخر کرتی ہے۔ اتنی بڑی سلطنت کے سربراہ ہونے کے باوجود ورع وتقویٰ میں بے مثل ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو شخص جس قدر اس کتاب کے قریب ہوگا اسی قدر اسے شرف و امتیاز نصیب ہوگا اور اس کے مقابل جو شخص جس قدر اِس کتاب کی تعلیمات سے رُوگردانی کرے گا اسی قدر وہ ذلّت وخواری کا شکار ہوگا۔ علامہ اقبالؒ نے اپنی مشہور نظم "شکوہ" میں مسلمانوں کی موجودہ ذلّت وخواری کا اس طرح رونا رویا ہے ؎

کیوں مسلمانوں میں ہے دولتِ دُنیا نایاب
تیری قدرت تو ہے وہ جس کی نہ حد ہے نہ حساب
تو جو چاہے تو اُٹھے سینۂ صحرا سے حباب
رہروِ دشت ہو سیلی زدۂ موجِ سراب
طعنِ اغیار ہے، رُسوائی ہے، ناداری ہے
کیا تیرے نام پہ مرنے کا عوض خواری ہے

اس کے بعد علامہ اقبالؒ نے "جوابِ شکوہ" میں مسلمانوں کی پستی کی وجہ خُود ہی یُوں بیان فرمائی ہے ؎

ہر کوئی مستِ مئے ذوقِ تن آسانی ہے
تم مُسلماں ہو؟ یہ اندازِ مسلمانی ہے؟
حیدری فقر ہے نَے دَولتِ عثمانی ہے

تم کو اسلاف سے کیا نسبتِ رُوحانی ہے؟

وہ زمانے میں مُعزز تھے مسلماں ہوکر
اور تم خوار ہُوئے تارکِ قُرآں ہوکر

ان اشعار میں علامہ نے مسلمانوں کی موجُودہ پستی کا واحد سبب قرآن سے علیحدگی قرار دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر آج بھی مُسلمان مل کر قُرآن کی راہ پر چلیں تو وہ عزت و شرافت یقیناً آج بھی انہیں نصیب ہوسکتی ہے۔

۳ : تربیت و تزکیہ کے لحاظ سے اس کتاب میں بلا کی خوبی ہے۔ اس کی تربیت سے انسانی قلب و دماغ، جذبات و خواہشات، رجحانات و میلانات اور سیرت و کردار کا بخوبی تزکیہ ہوتا ہے، جس کی بدولت انسان اخلاقی فضائل اپنے اندر پیدا کرتا ہے اور پھر اس کی ہر بات دل میں اُتر جاتی ہے۔ اس کی تلاوت سے جہاں قلب میں خشوع و خضوع پیدا ہوتا ہے، وہاں عزم و یقین کی دولت بھی نصیب ہوتی ہے۔

قرآنِ مجید کی تاثیر

قران مجید چُونکہ کلامِ الٰہی ہے اس لیے اس کے پڑھنے والوں کے لیے بلا کی تاثیر لکھ دی گئی ہے۔ اس تاثیر کا اندازہ قرآن مجید کی اس آیت سے ہوتا ہے :-

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ (سورۃ الحشر: ۲۱)

ترجمہ : اگر ہم اتارتے یہ قرآن ایک پہاڑ پر تو تو دیکھ لیتا کہ وہ دب جاتا پھٹ جاتا اللہ کے ڈر سے۔

یہ اسی تاثیر کا سبب ہے کہ ایک مومن اس کی تلاوت کے دوران میں ایک عجیب کیفیت اپنے دل میں محسوس کرتا ہے۔ یہی دراصل ایمانی کیفیت ہے، جو تعلق باللہ میں استواری اور قرآنی تعلیمات کو اپنے اندر جذب کرنے کا باعث بنتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ حضورؐ صحابہؓ سے قرآن مجید سُنتے اور اس موقع پر آپؐ پر رِقّت کی عجیب پُرکیفیت حالت طاری ہو جاتی۔ اس بارے میں ایک حدیث ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے مجھے فرمایا کہ مجھے قرآن سناؤ۔ میں نے عرض کی اے خدا کے رسول میں آپؐ کو قرآن سُناؤں حالانکہ آپؐ پر قرآن نازل ہُوا ہے۔ آپؐ نے فرمایا میں اوروں سے قرآن سُننا پسند کرتا ہُوں۔ چنانچہ میں سُورت نساء پڑھنے لگا۔ جب میں اس آیت پر پہنچا۔

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ۝ (سورۃ النّساء : ۴۱)

ترجمہ : پھر کیا حال ہو گا جب بلا دیں گے ہم ہر امّت میں سے احوال کہنے والا اور بلا دیں گے تجھ کو ان لوگوں پر احوال بتانے والا۔

تو آپؐ نے فرمایا۔ اب بس کرو۔ میں نے آپؐ کی طرف نظر اُٹھا

کر دیکھا تو آپؐ کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ قرآن کی تلاوت کے دوران میں صحابہ رضؓ کی کیا کیفیت تھی۔ اس بارے میں مفسر ابن کثیر اپنی تفسیر میں یوں لکھتے ہیں۔ "وہ نہ چیختے تھے اور نہ تکلفات سے کام لے کر کسی مصنوعی کیفیت کا مظاہرہ کرتے تھے، بلکہ وہ ثبات وسکون، ادب و خشیت میں اس قدر ممتاز تھے کہ ان صفات میں ان کی کوئی برابری نہ کر سکا۔" (تفسیر ابن کثیر جلد ۴، صفحہ ۵۱)

مومن کا دل تلاوتِ قرآن کے وقت جہاں کانپ اُٹھتا ہے اس کے ساتھ اس کے دل میں سکون کی کیفیت بھی طاری ہوتی ہے۔ گویا بدن اور دل کے نرم پڑنے کا مطلب ہی سکون کا حاصل ہو جانا ہے، جو رحمتِ الٰہیہ کے نزول کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ قرآن و حدیث سے ثابت ہے کہ تلاوتِ قرآن کے وقت سکون و رحمت کا نزول ہوتا ہے، اس لیے اس وقت رحمتِ الٰہیہ کا امیدوار بننے کے لیے قرآن مجید کو توجہ اور خاموشی سے سُننے کا حکم دیا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:-

وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ۝ (سورۃ الاعراف : ۲۰۴)

ترجمہ: اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کی طرف کان لگائے رہو اور چُپ رہو تاکہ تم پر رحم ہو۔

یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت کے امیدوار یہی لوگ ہیں جو قرآن مجید کو توجہ سے سُنتے ہیں۔ تاکہ اس کے ذریعے قرآن ان کے دلوں میں

اُتر جائے۔

تعارفِ حدیث

حدیث کے معنی

قرآنِ کریم دینِ فطرت کی آخری اور مکمّل کتاب ہے، جو حضرت خاتم النبیّین صلّی اللہ علیہ وسلّم پر نازل کی گئی اور آپؐ کو اس کا مبلّغ اور معلّم بنا کر دنیا میں مبعوث کیا گیا۔ چنانچہ آپؐ نے اس کتابِ خداوندی کو اوّل سے آخر تک لوگوں کو سنایا، لکھوایا، یاد کرایا اور بخوبی سمجھایا اور خود اس کے جُملہ احکامات و تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر امت کو دکھایا۔ حضورؐ کی حیات طیبہ حقیقت میں قرآن مجید کی قولی اور عملی تفسیر و تشریح ہے۔ اور آپؐ کے انھی اقوال، اعمال اور احوال کا نام حدیث ہے۔ عربی زبان میں لفظ "حدیث" وہی مفہوم رکھتا ہے جو ہم اردو میں گفتگو، کلام یا بات سے مُراد لیتے ہیں۔ چُونکہ حضور علیہ السلام گفتگو اور بات کے ذریعے سے پیامِ الٰہی کو لوگوں تک پہنچاتے، اپنی تقریر اور بیان سے کتاب اللہ کی شرح کرتے اور خود اس پر عمل کر کے اس کو دکھلاتے تھے۔ اسی طرح جو چیزیں آپؐ کے سامنے ہوتیں اور آپؐ ان کو دیکھ کر یا سُن کر خاموش رہتے تو اسے بھی دین کا حصّہ سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ اگر وہ امُور منشاءِ دین کے منافی ہوتے تو آپ یقیناً ان کی اصلاح کرتے یا منع فرماتے۔ اس لیے ان سب کے مجموعے کا نام احادیث قرار پایا۔

حدیث کی دینی حیثیت

حدیث شریف کا دین میں کیا درجہ ہے؟ اس کو ذہن نشین کرنے کے لیے حضرت محمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم کی حسبِ ذیل حیثیات کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے، جن کو قرآن پاک نے نہایت صراحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے :-

۱ : آپؐ کی ذات قدسی صفات میں ہر مومن کے لیے اُسوۂ حسنہ ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًاؕ (سورۃ الاحزاب: ۲۱)

ترجمہ: رسول اللہ کا ایک عمدہ نمونہ موجود ہے تمہارے لیے یعنی اُس کے لیے جو ڈرتا ہو اللہ اور روزِ آخرت سے اور ذکرِ الٰہی کثرت سے کرتا ہو۔

۲ : آپؐ کی اتباع سب پر فرض ہے :-

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ (سورۃ الاعراف : ۱۵۸)

ترجمہ: سو ایمان لاؤ اللہ پر اور اس بھیجے ہوئے نبی امی پر کہ جو یقین رکھتا ہے اللہ پر اور اس کے سب کلاموں پر اور اس کی پیروی کرو۔

۳ : جو کچھ آپؐ دیں اس کو لینا اور جس چیز سے منع فرمائیں اس سے باز رہنا ضروری ہے :-

وَمَا اٰتَاکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهَاکُمْ

عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ (سورۃ الحشر : ۷)

ترجمہ : اور جو دے تم کو رسُول سو لے لو اور جس سے منع کرے سو چھوڑ دو۔

۴ : آپؐ کی اطاعت تمام مسلمانوں پر فرض ہے :-

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا

الرَّسُوْلَ (سورۃ محمّد : ۳۳)

ترجمہ : اے ایمان والو! حکم پر چلو اللہ کے اور حکم پر چلو رسول کے۔

۵ : ھدایت آپؐ کی اطاعت سے وابستہ ہے :-

وَ اِنْ تُطِیْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ؕ (سورۃ النّور : ۵۴)

ترجمہ : اور اگر اس کا کہا مانو تو راہ پاؤ۔

ان آیات سے معلُوم ہوا کہ حضرت محمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم نے جس قدر امت کو ھدایتیں دیں، جو جو چیزیں ان سے بیان فرمائیں اور کتاب وحکمت کی تعلیم کے ذیل میں جو کچھ ارشاد فرمایا، جن چیزوں کو حلال اور جن کو حرام ٹھہرایا۔ باھمی معاملات وقضا میں جو کچھ فیصلہ فرمایا، ان سب کی حیثیت دینی اور تشریعی ہے۔

یہی نہیں بلکہ آپؐ کی پوری زندگی اُمت کے لیے بہترین نمونۂ عمل ہے جس کے اِتباع اور پیروی کا ہم کو حکم دیا گیا ہے۔ آپؐ کی اطاعت ہر اُمتی پر فرض ہے۔ جو آپؐ حکم دیں اس کو بجالانا اور جس سے منع کریں اس سے رُک جانا، ہر مومن کے لیے لازم اور ضروری ہے۔ مختصر یہ کہ آپؐ کی اطاعت ہی حقیقت میں حق تعالیٰ کی اطاعت ہے چنانچہ قرآن کریم میں تصریح ہے۔

مَنۡ یُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰہَ ۚ (سورۃ النساء : ۸۰)

ترجمہ : اور جس نے حکم مانا رسُول کا اُس نے حکم مانا اللہ کا۔

یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ کی بات ماننا فرض اور ضروری ہے۔ اسی طرح حضرت مُحمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بات ماننا بھی لازمی اور حتمی ہے۔ ظاہر ہے کہ جملہ احکامِ دین کے متعلق کلّی احکام قرآن مجید میں موجود ہیں۔ لیکن ان احکام کی تشریح، ان کے جزئیات کی تفصیل اور ان کی عملی تشکیل رسول کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اقوال و اعمال اور آپؐ کے احوال کے جانے بغیر حضرت محمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اتّباع اور اطاعت کے ناممکن اور محال ہے۔

حدیث کی حفاظت

قرآن مجید جو دین کی تمام بنیادی تعلیمات پر مشتمل اور جملہ عقائد و احکام کے متعلق کلی ہدایات کا حامل ہے۔ اس کا ہر لفظ لوگوں نے زبانی یاد کیا۔ مزید احتیاط کے لیے معتبر کاتبوں سے خود حضرت

رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس کو لکھوالیا۔ حدیث شریف جو شرع اسلامی کی تمام اعتقادی اور عملی تفصیلات پر حاوی ہے۔ اس کا قولی حصہ صحابہ کرامؓ نے اپنی قومی عادت اور رواج کے مطابق اس سے بھی زیادہ اہتمام کے ساتھ اپنے حافظہ میں رکھا کہ جس اہتمام کے ساتھ وہ اس سے پہلے اپنے خطیبوں کے خطبے شاعروں کے قصیدے اور حکماء کے مقولے یاد رکھا کرتے تھے اور اس کے عملی حصے کے مطابق فوراً عمل کرنا شروع کر دیا گیا۔

خود حضرت مُحمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم نے بھی متعدد مواقع پر ضروری احکام و ہدایات کو قلم بند کروایا۔ ان تحریروں اور نوشتوں کا ذکر مُعتبر کتبِ حدیث میں محفوظ ہے۔ لیکن ان کے علاوہ مختلف قبائل کو تحریری ہدایات، خطوط کے جوابات، مدینہ منورہ کی مردم شماری کے کاغذات، سلاطینِ وقت اور مشہور فرمانرواؤں کے نام اسلام کے دعوت نامے، معاہدات، امان نامے اور اس قسم کی بُہت سی متفرق تحریرات تھیں جو حضرت مُحمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم نے وقتاً فوقتاً قلم بند کروائیں۔ مشہور ہے کہ غزوہ بدر کے بعد مدینہ میں بہت سے مسلمانوں نے لکھنا بھی سیکھ لیا اور پھر کتابتِ حدیث کا سلسلہ جاری ہوگیا۔ اگرچہ عرب کی قوم اسلام سے پہلے اَن پڑھ تھی اور ان میں کسی قسم کی تعلیم کا رواج نہ تھا لیکن ایمان اور اسلام کی بدولت صحابہ میں یہ شوق پیدا ہوگیا اور ان میں سے بہت سے حضرات ایسے تھے کہ وہ حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کی زبان مبارک سے جو کچھ سنتے تھے حِفظ کرنے کے ارادے سے قلم بند کر لیتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرات صحابہؓ حضرت محمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم

کی احادیث کو یاد کرنے اور جمع کرنے کا کس قدر اہتمام فرماتے تھے۔ ان کے پیشِ نظر حضورؐ کا یہ ارشاد رہا۔ "اللہ تعالیٰ اس شخص کو خوش وخرّم رکھے جس نے میری حدیث کو سُنا پھر اس کو یاد کیا۔ پھر اسی طرح آگے پہنچایا جس طرح کہ سنا تھا۔" (ترمذی۔ ابوداؤد۔ ابن ماجہ)

تدوینِ حدیث

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ بعض صحابہؓ نے حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کی زندگی میں حدیثیں لکھی تھیں جیسا کہ آپ اوپر پڑھ چکے ہیں کہ خود نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے بھی بہت سے احکام وہدایات کو قلم بند کروایا۔ یہ حقیقت خوب واضح ہوتی ہے کہ تدوین کا آغاز عہدِ رسالت ہی میں ہو گیا نہ کہ دوسری صدی ہجری میں جیسا کہ مستشرقین کہتے ہیں۔ اسلام کے ابتدائی عہد میں احادیثِ نبویہؐ پر مشتمل جو صحیفے لکھے گئے ہمارے پاس ان کا تاریخی ثبوت موجود ہے۔ ان صحیفوں میں حضرت عبد اللہؓ بن عمرو بن العاص کا صحیفہ صادقہ بہت مشہور ہے اور اسی طرح حضرت علی رضؓ کا صحیفہ بھی تھا۔ جس میں بہت سے احکام ومسائل درج تھے۔ مگر اس سلسلے میں سب سے بڑی اہمیت صحیفۂ ابی ہریرہ رضؓ کی ہے جو ابوہریرہ رضؓ سے ان کے عزیز شاگرد ہمام بن منبہ نے روایت کیا ہے۔ یہ صحیفہ تدوینِ حدیث کے سلسلہ میں اس لیے اہمیت کا حامل ہے کہ یہ تمام وکمال اسی طرح ہم تک پہنچ گیا ہے جس طرح ہمام نے اسے حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت کیا اور پھر اس کو مرتّب کیا تھا۔ اس صحیفہ کی کھوج کھاج اس طرح نکالی گئی کہ چند سال پہلے دو

مخطوطے دستیاب ہُوئے۔ ایک برلن میں اور دوسرا دمشق میں جن میں کوئی بھی فرق نہ تھا، جبکہ یہ صحیفہ مسند امام احمدؒ میں مکمّل طور پر محفوظ ہے۔ نیز اس کی بیشتر احادیث صحیح بخاری کے مختلف ابواب میں موجود ہیں۔ اسی طریقہ سے عصرِ حاضر کی تحقیقات نے حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کے متعدّد خطوط و وثائق منکشف کر دیے ہیں۔ جن میں مقوقس مصر اور نجاشی کے ناموں سے دعوت نامے مشہور ہیں۔

تدوینِ حدیث کا دورِ ثانی

بہر حال یہ ایک واقعہ ہے، کہ پہلی صدی ہجری میں تدوین حدیث کا آغاز ہُوا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عام طور پر اہلِ عرب جو ہر چیز کو زبانی یاد رکھنے کے عادی تھے، انہیں لکھنا بڑا گراں گزرتا تھا، جس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ عربوں کا حافظہ فطرتًا نہایت قوی تھا، اور وہ جو کچھ لکھتے تھے اس سے مقصود صرف اس کو ازبر کرنا ہوتا تھا۔ ابھی صدی ختم نہ ہونے پائی تھی، اور صحابہ کرامؓ دُنیا سے رخصت ہو رہے تھے کہ سن ۹۹ ہجری میں جب خلیفہ عُمر بن عبد العزیزؒ نے دیکھا کہ متبرک صحابہ سے دُنیا خالی ہو رہی ہے تو آپ کو اندیشہ ہُوا کہ ان حفّاظ اہلِ علم کے اُٹھنے سے کہیں علوم حدیث نہ اُٹھ جائیں۔ چنانچہ آپ نے فورًا اتمام ممالک کے علما کے نام فرمان بھیجا کہ احادیثِ نبوی کو تلاش کر کے جمع کر لیا جائے۔ پس اس حکم کی تعمیل میں کوفہ کے امام شعبی، مدینہ کے امام زہریؒ اور شام کے امام مکحولؒ کی تصانیف وجود میں آئیں

اور وہ اسی عہدِ خلافت کی یادگار ہیں۔ اسی طرح پہلی صدی کے آخر میں کبار ائمہ تابعین رح نے جمع و تدوینِ حدیث میں بھرپور حصہ لیا۔

دوسری صدی ہجری میں اس سلسلے کو اتنی ترقی ہوئی کہ احادیث نبویہ تو ایک طرف، صحابہ رض اور اہلِ بیت رض کے آثار اور تابعین رح کے فتاوٰی اور اقوال تک، ایک ایک کر کے اس عہد کی تصانیف میں مرتّب و مدوّن کر لیے گئے۔ ان تصانیف میں سے سب سے نامور امام ابو حنیفہ رح کی کتاب "الآثار"۔ امام مالک رح کی "موطا" اور امام سفیان ثوری رح کی "جامع" ہیں۔ اس صدی میں فقہ حنفی اور فقہ مالکی کی تدوین ان احادیث و آثار کی روشنی میں مکمل ہوئی کہ جس پر صحابہ رض اور تابعین کا عمل درآمد چلا آتا تھا۔

تدوین حدیث کا دور ثالث

تیسری صدی ہجری میں علمِ حدیث کا ایک شعبہ پایہ تکمیل کو پہنچا۔ محدّثین نے طلبِ حدیث میں دنیائے اسلام کا گوشہ گوشہ چھان مارا اور تمام منتشر اور پراگندہ روایتیں یکجا کیں۔ مستند حدیثیں علیحدہ کی گئیں۔ صحتِ سند کا التزام کیا گیا۔ اسماء الرجال کی تدوین ہوئی۔ جرح و تعدیل کا مستقل فن بن گیا اور صحاح ستہ جیسی بیش بہا کتابیں تصنیف ہوئیں۔ ذیل میں صحاح ستہ اور ان کے مصنّفین فہرست کے طور پر درج ہیں:-

صحاح ستہ

۱ : صحیح بخاری۔ امام ابو عبد اللہ محمّد بن اسمٰعیل بخاری رح (۱۹۴ تا ۲۵۶ ہجری)

۲ : صحیح مُسلم - امام مسلم بن حجاج بن مسلم قشیری رح

(ف ۲۶۱-ہجری)

۳ : جامع الترمذی - امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذی رح

(ف ۲۷۹ ہجری)

۴ : سنن ابی داؤد - امام ابوُ داؤد سلیمان بن اشعث رح

(ف ۲۷۵ ہجری)

۵ : سنن النسائی - امام ابوعبدُ الرّحمٰن احمد بن علی النسائی رح

(ف ۳۰۳ ہجری)

۶ : سنن ابن ماجہ - امام ابو عبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہ القزوینی رح (ف ۲۷۳ ہجری)

اصُول اربعہ مندرجہ ذیل چار کتابیں فقہ جعفریہ رح کی مستند ترین ذخائر حدیث ہیں -

۱ : الکافی - ابو جعفر محمد بن یعقوب الکلینی رح

(ف ۳۳۹ ہجری)

۲ : من لا یحضرہ الفقیہ - ابو جعفر مُحمّد علی بن بابویہ قمیؒ

(ف ۳۸۱ ہجری)

۳ : الاستبصار - ابو جعفر محمد بن الحسن الطوسی رح

(ف ۴۶۰ ہجری)

۴ تہذیب الاحکام - ابو جعفر محمد بن الحسن الطّوسی رح

(ف ۴۶۰ ہجری)

مُنتخب آیات

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا ۝ لا
یُّصْلِحْ لَکُمْ اَعْمَالَکُمْ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ ط
وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا
عَظِیْمًا ۝ (سورۃ الاحزاب: ۷۰، ۷۱)

ترجمہ: اے ایمان والو! ڈرتے رہو اللہ سے اور کہو بات سیدھی کہ سنوار دے تمہارے واسطے تمہارے کام اور بخش دے تم کو تمہارے گناہ اور جو کوئی کہنے پر چلا اللہ کے اور اس کے رسُول کے اس نے پائی بڑی مُراد۔

تشریح ان آیات کے شروع میں دو باتوں، یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرنے اور درست بات کہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ تقویٰ کے معنی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہُوئے دین و شریعت کے احکام کی بجا آوری ہے۔ دُوسری تاکید یہ ہے کہ آدمی ہمیشہ درست بات کہے جھوٹ وغیرہ کا اس میں احتمال نہ ہو۔ اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ وہ تمہارے اعمال درست کر دے گا اور اس کے ساتھ ہی آخرت کی مغفرت کا وعدہ بھی فرمایا گیا ہے۔

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ (سورۃ الاحزاب: ۲۱)

ترجمہ: تمہارے لیے رسول اللہ میں بہترین نمونہ موجود ہے۔

تشریح یہاں عام ضابطے کے طور پر مسلمانوں سے ارشاد فرمایا گیا، کہ تمہیں روزمرّہ کے کاموں میں حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا طریقۂ کار اختیار کرنا چاہیے۔ گویا حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم سب مسلمانوں کے لیے نمونہ ہیں۔ جو شخص اپنی زندگی میں آپؐ کو نمونہ بنا کر جس قدر محاسن اپنے اندر پیدا کرے گا، اسی قدر اللہ کے ہاں مقبول ہو سکتا ہے۔ دنیا و آخرت کی تمام سعادتیں صرف آپؐ کی ذات کی اتباع، اطاعت اور تقلید سے وابستہ کر دی گئی ہیں۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (سورۃ آل عمران: ۱۰۳)

ترجمہ: اور مضبوط پکڑو رسی اللہ کی سب مل کر اور پھوٹ نہ ڈالو۔

تشریح اس آیت میں اللہ کی کتاب کو مضبوطی سے پکڑنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یعنی اس کے احکام پر عمل کرنے کا سب مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے اور مسلمانوں میں تفرقہ بازی وغیرہ سے منع کر دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ مسلمانوں میں تفرقہ اسی وقت پیدا ہوتا ہے، جبکہ مسلمان اللہ تعالیٰ کے احکام چھوڑ دیں۔ پھر عداوت، خود غرضی، حسد، کینہ اور بُغض جیسی بُرائیاں پیدا ہو کر مسلمانوں کو باہم ایک دُوسرے کے خلاف کر دیتی ہیں اور اس

کے برعکس اگر مسلمان اللہ تعالیٰ کی کتاب کو اپنا رہبر بنائیں، اس کے احکام پر عمل کریں تو سب برائیوں کی جگہ محبت، دوستی، اخلاص مروت، ہمدردی جیسی بھلائیاں پیدا ہوں گی۔

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ۚ (سورۃ الحجرات: ۱۳)

ترجمہ: بے شک اللہ کے یہاں تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں زیادہ پرہیزگار ہے

تشریح سیاق وسباق کے لحاظ سے آیت کا یہ ٹکڑا اس مقام پر وارد ہوا ہے جہاں مسلمانوں کو عیب جوئی اور طعن وتشنیع سے منع کیا گیا ہے۔ بسا اوقات برائیوں کا ارتکاب آدمی اس وقت کرتا ہے جب وہ اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھ لے اور دوسروں کو حقیر سمجھ لے۔ اس موقع پر ارشاد ربانی کا مقصد یہ ہے کہ انسان کا چھوٹا بڑا یا معزز یا حقیر ہونا، ذات پات یا خاندان ونسب کی وجہ سے نہیں ہوتا، بلکہ قرآن کی زبان میں جو شخص جس قدر نیک خصلت، مؤدب اور پرہیزگار ہو اسی قدر اللہ کے ہاں معزز ومکرم ہے۔ نسب کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ سب انسان آدم وحوا کی اولاد ہیں، اسی واسطے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ حجۃ الوداع میں فرمایا تھا "کسی عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر فضیلت نہیں سرخ کو سیاہ اور سیاہ کو سرخ پر فضیلت نہیں، مگر تقویٰ کے سبب۔"

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ۝ (سورۃ آل عمران: ۱۹۰)

ترجمہ: بے شک آسمان اور زمین کا بنانا اور رات اور دن کا آنا جانا اس میں

نشانیاں ہیں عقل والوں کے لیے۔

تشریح اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نشانیوں کا ذکر فرما کر عقل مندوں کو اس جہان کے کارخانہ پر غور کرنے کی دعوت دی ہے، تاکہ اس غور و فکر سے اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا ان کے لیے آسان ہو جائے۔ قرآن غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ لیکن غور و فکر ایسا چاہیے جس سے اللہ کی معرفت نصیب ہو۔ اس کے برعکس ایسا غور و فکر جس کے نتیجے میں خداوند تعالیٰ سے دُوری ہو اور انسان یہ سمجھ لے کہ اس جہان کا کارخانہ خود ہی چل رہا ہے۔ ایسے لوگ قرآن کی زبان میں عقلمند نہیں، بلکہ عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی یقین کرے کہ یہ سارا مربوط و منظّم سلسلہ ضرور کسی ایک مختارِ کُل اور قادرِ مطلق فرمانروا کے ہاتھ میں ہے۔ جس نے اپنی عظیم قدرت و اختیار سے ہر چھوٹی بڑی مخلوق کی حدبندی کر دی ہے۔ کسی چیز کی مجال نہیں کہ اپنے دائرۂ عمل سے باہر قدم نکال سکے۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۚ (سورۂ آل عمران : ۹۲)

ترجمہ: ہرگز نہ حاصل کر سکو گے نیکی میں کمال جب تک نہ خرچ کرو اپنی پیاری چیز سے کچھ۔

تشریح عموماً انسان مال و دولت سے زیادہ محبت کرتا ہے۔ اس محبت کو کمزور کرنے کے لیے قرآن نے یہ رہنمائی فرمائی کہ اللہ کی خُوشنودی کی خاطر مال و دولت میں سے پیاری چیز اس کی راہ میں خرچ کرو۔ تاکہ ایک طرف اللہ کی محبت بڑھے اور اس کے ساتھ یقین پیدا ہو کہ مال و دولت اللہ کی دی ہُوئی ہے، اسی کی راہ میں خرچ ہونی چاہیے اور اس عمل کو نیکی شمار کیا ہے۔

جاہلیت میں لوگ عام طور اپنی ذاتی شہرت اور بڑائی کے لیے مال خرچ کرتے اور اس پر فخر کرتے تھے۔ قرآن نے جہاں اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کی تعلیم دی ہے وہاں ذاتی اغراض کے تمام پہلو ردّ کر دیے ہیں۔

وَمَا اٰتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (سورۃ الحشر: ۷)

ترجمہ: اور جو دے تم کو رسولؐ سو لے لو اور جس سے منع کرے اسے چھوڑ دو۔

تشریح آیت کا مفہوم عام ہے۔ یعنی حضورؐ جو کام کرنے کو فرمائیں فوراً کرو۔ اور جس سے روکیں اس سے رُک جاؤ۔ یعنی ہر عمل اور ارشاد میں آپؐ کی تعمیل ہونی چاہیے۔ گویا اس آیت میں صحیح اسلامی زندگی گزارنے کا طریقہ بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے رسولؐ جو کچھ فرماتے ہیں وہ برحق ہے اور اللہ کی ہدایت سے احکام بیان فرماتے ہیں اور خود عمل کرتے ہیں۔

اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ (سورۃ العنکبوت: ۴۵)

ترجمہ: بے شک نماز روکتی ہے بے حیائی اور بری بات سے۔

تشریح آیتِ بالا کے اس ٹکڑے نے واضح کیا ہے کہ نماز میں ایسی خوبی ضرور ہے جس کے سبب نمازی بے حیائی اور بُرائی سے بچ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر انسانی بیماری کے سلسلے میں جب جسمانی بیماری کی تشخیص ہو جائے اور اس کے لیے مناسب دوائی بھی تجویز ہو، تو دوا ضرور اثر دکھاتی ہے، بشرطیکہ بیمار کسی ایسی چیز کا استعمال نہ

کرے جو اس دوا کی تاثیر کے خلاف ہو۔ اس اعتبار سے واقعی نماز بھی قوی التاثیر ہے۔ اس کا مفہوم دوسرا یہ بھی ہے کہ نماز کے اندر چند ایسی خوبیاں ہیں جن کی موجودگی میں آدمی کے لیے جو واقعی نماز خلوص سے پڑھتا ہو، ممکن نہیں کہ بے حیائی اور برائی کی طرف جھکے۔

وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۚ (سورۃ الانعام : ۱۶۴)

ترجمہ: اور جو کوئی گناہ کرتا ہے سو وہ اس کے ذمہ پر ہے اور بوجھ نہ اُٹھانے گا ایک شخص دوسرے کا۔

تشریح قرآن کا دعویٰ ہے کہ ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔ جو شخص جیسے اعمال کرے گا، اچھے ہوں یا بُرے۔ اس کے مُطابق جزا و سزا پائے گا۔ گویا اچھے اعمال کی اچھی جزا اور بُرے اعمال کی بُری سزا۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (سورۃ النّحل : ۹۰)

ترجمہ: اللہ حکم کرتا ہے انصاف کرنے کا اور بھلائی کرنے کا۔

تشریح آیت کے اس حصہ میں عدل و احسان کا حکم دیا گیا ہے۔ عدل کے معنی انصاف کے ہیں۔ یعنی کسی کو اس کا پُورا حق ادا کرنا، اور احسان یہ ہے کہ کسی سے اس کے حق سے بڑھ کر مُروّت اور نیکی کرنا۔ اس آیت میں جہاں لین دین کے معاملے میں انصاف کرنے کا حکم موجود ہے وہاں سب عقائد، اخلاق اور اعمال

کے معاملے میں بھی انصاف کا حکم دیا گیا ہے۔ اس پوری آیت میں تمام بھلائیوں کو جمع کیا گیا ہے۔ اس لیے اس آیت کی جامعیت کے پیشِ نظر حضرت عمر بن عبد العزیز رح نے اس آیت کو خطبۂ جمعہ کے آخر میں شامل کر دیا تھا۔ جو آج تک جمعہ کے روز خطبہ کے آخر میں پڑھا جاتا ہے۔

مُنتخب احادیث

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ، وَاِنَّمَا لِکُلِّ امْرِئٍ مَّا نَوٰی

(بخاری۔ مُسلم۔ ابو داؤد۔ نسائی۔ ابن ماجہ۔ اصُول کافی) (بالفاظ مختلفہ)

ترجمہ: بے شک، اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ اور بے شک انسان وہی کچھ پائے گا جو اس نے نیّت کی ہو گی۔

اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ حُسْنَ الْاَخْلَاقِ (موطا امام مالک)

ترجمہ: بے شک مجھے اس خاطر رسول بنا کر بھیجا گیا ہے تاکہ میں اعلیٰ اخلاق کی تکمیل کروں۔

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ

مِنْ وَّالِدِہٖ وَوَلَدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ (بخاری ومسلم)

ترجمہ: تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک ایمان دار نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں

اسے اس کے والدین اور اولاد اور سب لوگوں سے بڑھ کر محبوب نہ ہو جاؤں۔

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ

(بخاری - ترمذی - نسائی - ابن ماجہ - سنن دارمی - مسند احمد بن حنبل - اصول کافی بالمعنی)

ترجمہ: تم میں سے کوئی ایک اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے وہ چیز پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِہٖ وَیَدِہٖ

(بخاری - مسلم - ابو داؤد - ترمذی - نسائی - سنن دارمی - مسند احمد بن حنبل - اصول کافی)

ترجمہ: مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں۔

لَا یَرْحَمُہُ اللّٰہُ مَنْ لَّا یَرْحَمُ النَّاسَ

(مسلم - ترمذی - مسند احمد بن حنبل)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ اس پر رحم نہیں فرماتے جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا۔

کُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَی الْمُسْلِمِ حَرَامٌ دَمُہٗ وَمَالُہٗ وَعِرْضُہٗ

(ابن ماجہ - مسند احمد بن حنبل)

ترجمہ: ہر مسلمان کا سب کچھ دوسرے مسلمان پر حرام ہے۔ اس کا خون اس کا مال اور اس کی عزت۔

مَا عَالَ مَنِ اقْتَصَدَ

(مسند احمد بن حنبل - اصول کافی بالمعنی)

ترجمہ: جس نے میانہ روی اختیار کی، وہ محتاج نہیں ہو گا۔

مَنْ سَلَكَ طَرِيْقًا يَطْلُبُ فِيْهِ عِلْمًا سَلَكَ

اللّٰهُ بِهٖ طَرِيْقًا مِّنْ طُرُقِ الْجَنَّةِ

(بخاری - ابو داؤد - ترمذی - ابن ماجہ - مسند احمد بن حنبل)

ترجمہ : جو شخص علم کی تلاش میں کسی راستے پر چلتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے جنت کے راستوں میں سے کسی راستہ پر لے جاتا ہے۔

اَلْمُؤْمِنُ اَخُو الْمُؤْمِنِ كَالْجَسَدِ الْوَاحِدِ اِنِ اشْتَكٰى

شَيْئًا مِّنْهُ وَجَدَ اَلَمَ ذٰلِكَ فِيْ سَآئِرِ جَسَدِهٖ

(مسلم - ترمذی - مسند احمد بن حنبل - اصول کافی)

ترجمہ : ہر مومن دوسرے مومن کا بھائی ہے۔ جیسے ایک جسم۔ اگر اس جسم کا کوئی حصہ بھی تکلیف میں مبتلا ہو تو وہ اپنے سارے جسم میں تکلیف محسوس کرے گا۔

سوالات

۱ : قرآن مجید کے اسما کون کون سے ہیں؟ پہلی وحی کے نزول کا واقعہ تفصیل سے لکھیں۔

۲ : مکّی اور مدنی سورتوں کی خصوصیات تحریر کریں۔

۳ : حجۃ الوداع کی تفصیل بیان کریں۔

۴ : مختصر نوٹ لکھیں۔

۱ : قرآن مجید کی حفاظت۔ ۲ : قرآن مجید کی ترتیب

۵ : مندرجہ ذیل پر مختصر نوٹ لکھیں۔

۱۔ عہدِ صدیقی میں قرآن مجید کی جمع وتدوین

۲۔ قرآن مجید کا انداز بیان۔

۳۔ قرآن مجید کی خوبیاں

٦ : حدیث کے معنی بیان کریں۔ حدیث کی اپنی حیثیت کیا ہے؟

۷ : تدوین حدیث کے تینوں ادوار کا تفصیلی ذکر کریں۔

۸ : صحاح ستّہ اور ان کے مصنفین کے نام مع ان کے سن وفات لکھیں۔

۹ : اصول اربعہ اور ان کے مصنفین کے نام مع ان کے سن وفات لکھیں۔

تمّت بالخیر

جملہ حقوق بحق بلوچستان ٹیکسٹ بک بورڈ کوئٹہ محفوظ ہیں تیار کردہ پنجاب
ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور منظور کردہ بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن
کوئٹہ بلوچستان بطور واحد نصابی کتاب برائے کالجز صوبہ بلوچستان
بمطابق نوٹیفیکیشن نمبر 719-89/Res/1993 مورخہ 12-6-93
قومی کمیٹی برائے جائزہ کتب وفاقی وزارت تعلیم حکومت پاکستان کی منظور کردہ۔
قومی ترانہ
پاک سرزمین شاد باد
کشورِ حسین شاد باد
تُو نشانِ عزمِ عالی شان
ارضِ پاکستان
مرکزِ یقین، شاد باد
پاک سرزمین کا نظام
قوتِ اُخوتِ عوام
قوم، مُلک، سلطنت
پائندہ تابندہ باد
شاد باد منزلِ مُراد
پرچم ستارہ و ہلال
رہبرِ ترقّی و کمال
ترجمانِ ماضی شانِ حال
جانِ استقبال
سایۂ خُدائے ذُوالجلال
Rishi
قیمت
18/-
تعداد اشاعت
400
ایڈیشن
1st
سال ا 403
2002